ماہنامہ

# فکرِ نو

علی گڑھ

فروری ۲۰۱۹ء

مدیر

## ریاض الرحمٰن شروانی

ماہنامہ

# فکرِ نو

علی گڑھ

مدیر

رياض الرحمٰن شروانی

معاون مدیر

ڈاکٹر مفتی زاہد علی خاں

سال دوم ☆ فروری ۲۰۱۹ء ☆ شمارہ نمبر (۷)



قیمت فی شمارہ: ۱۵ روپے

قیمت سالانہ: ۱۵۰ روپے

## فہرست



ادارے کا مضمون نگاروں کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں

پبلشر مسز غزالہ پروین نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائز علی گڑھ سے چھپوا کر حبیب منزل، میرس روڈ، علی گڑھ سے شائع کیا

اداریہ

# حالیہ دورِ انتشار

ہندوستان میں حالیہ دور میں خلفشار و ہنگامہ خیزی اس وقت شروع ہوئی جب بابری مسجد / رام جنم بھومی تنازعے کو سیاسی شکل دے کر مہم کا آغاز کیا گیا۔ بابری مسجد کی شہادت سے شروع ہو کر خلفشار اور فسادات کا سلسلہ گجرات کے ۲۰۰۲ء کے مسلم کش فسادات تک چلتا رہا۔ حالانکہ خود گجرات میں ۲۰۰۲ء کے بعد فسادات نہیں ہوئے ہیں لیکن ملک کے دوسرے حصوں میں خاص طور سے ہندی پٹی میں یہ سلسلہ جاری ہے اور رام مندر کی تعمیر کے جذباتی مدعے کو آج بھی سیاسی فوائد حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ یہ مار کاٹ اجتماعی بھی ہوتی رہی اور انفرادی بھی۔ البتہ اسی صدی کے آغاز میں جارج بش جونیئر کے زمانہ صدارت میں صدام حسین پر بدعنوانیوں کا الزام لگا کر جو قیامت ڈھائی وہ رفتہ رفتہ پورے مشرق وسطی میں پھیل گئی اور اس کی زد میں کئی حکمراں اور عوام آئے اور وہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ بعض صورتحال اتنی پیچیدہ ہے کہ اصلی مجرم کی نشان دہی کرنا امرِ دشوار ہو جاتا ہے تاہم پوشیدہ اصلی دشمن کا چہرہ نظر آ کر ہی رہتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس خلفشار کا نشانہ مسلمان بنتے ہیں۔ خود عراق کے علاوہ اس وقت شام، افغانستان، لیبیا اور فلسطین خاص طور سے زد میں ہیں۔

سب سے الجھا ہوا مسئلہ شام کا ہے۔ وہاں امریکہ جو کھیل کھیل رہا ہے وہ اس کی عام روش کے خلاف محسوس ہوتی ہے لیکن ذہن اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اسرائیل اور امریکہ ایک ہیں اور عربوں کے خلاف دونوں کی پالیسی یکساں ہے چاہے بظاہر کچھ بھی کہیں۔

افغانستان ایک آزادی پسند ملک ہے لیکن استعماری طاقتیں ہمیشہ کسی نہ کسی کے خلاف اسے بھڑاتی رہتی ہیں۔ اس کے ہمارے ملک سے ہمیشہ خوش گوار تعلقات رہے ہیں۔ یہ بات استعماری طاقتوں کو پسند نہیں آتی اور وہ چاہتی ہیں کہ ہندوستان سے بھی اسے بھڑا دیں لیکن اس مقصد میں وہ کامیاب نہیں ہوئی ہیں کہ انھیں آپس میں بھڑا کر دور سے تماشا دیکھیں۔ اب ہماری سمجھ بوجھ کا تقاضا ہے کہ ان کے جال میں نہ

پھنسیں۔ایک طرف روس سے ہمارے قدیمی دوستانہ تعلقات بحال رہیں، اور دوسری طرف افغانستان اور پاکستان بھی دانائی سے کام لیں اور ایک دوسرے کو پریشان نہ کریں۔

داعش کا آغاز عراق سے ہوا جب وہاں القاعدہ کمزور ہوگئی۔انہوں نے خاصے بڑے علاقے پر قبضہ کرلیا پھر شام میں بھی کچھ حصوں پر قبضہ کرلیا چونکہ بغدادی نے اپنے کو خلیفہ کہلوایا اور لوگوں میں یہ تاثر دیا کہ خلافت کا احیاء ہوگیا ہے لہٰذا وہاں کے مقامی باشندے اس تنظیم سے کافی تعداد میں وابستہ ہوگئے۔ان لوگوں نے پہلی بار ویب سائٹ بنائی اور لوگوں سے اپیل کی جس کے جواب میں کافی لوگ اس میں شامل ہوگئے اور صرف مسلمان اس کا حصہ نہیں بنے بلکہ کچھ ایسے غیر مسلم جو امریکی حکومت کے خلاف تھے وہ بھی اس کا حصہ بن گئے۔اس سے داعش کافی مضبوط ہوگئی اس کی شروعات اسرائیل اور امریکہ نے کی اور داعش کی آڑ لے کر امریکہ نے اسے ختم کرنے کے نام پر شام میں آگیا۔ وہ ناٹو فورسز کے ذریعہ بشر الاسد کو ہٹا کر اپنی کٹھ پتلی حکومت لانا چاہتا تھا۔لیکن امریکہ کا کھیل اس وقت بگڑا جب روس نے شام کی مدد کی۔بالآخر بشر الاسد کی حکومت برطرف نہیں ہوئی لیکن اس صورت حال سے وہاں کافی تباہی آئی۔جو مسلمان رفیوجی کیمپوں میں ہیں ان کو بھی داعش کا الزام لگا کر بے گناہوں کو مارا گیا اور مہاجرین کو اپنے یہاں داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔ بیشمار بچے جن کے ماں باپ مار دئے گئے وہ سڑکوں پر بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔امریکہ عموماً انہیں ممالک پر توجہ مرکوز کرتا ہے جہاں تیل کے ذخائر ہیں وہ کسی بھی طرح وہاں اپنی فرماں بردار حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔

پاکستان وجود میں آنے کے بعد سے ہی انتشار کا شکار رہا۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے اپنی پارٹی کے مسلمان لیڈروں کو اس خیال سے پاکستان بھیجا تھا کہ وہاں ان کی دال زیادہ گلے گی۔لیکن ہوا برعکس۔ایک روایت ہے، لیکن اس کی صداقت کی ضمانت ہم نہیں دے سکتے۔ایک دن رضیہ سجاد ظہیر جواہر لال نہرو کی کوٹھی کے زینے پر جا بیٹھیں، پنڈت جی وہاں پہنچے تو ان سے پوچھا تم یہاں کیسے بیٹھی ہو، انہوں نے کہا ''جب تک آپ سجاد ظہیر کو پاکستان کی جیل سے رہا نہیں کرائیں گے میں ایسے ہی بیٹھی رہوں گی''، پنڈت جی نے وعدہ وعید کیا۔اور آہستہ آہستہ سب کمیونسٹ اور ترقی پسند جو پاکستان چلے گئے تھے ہندستان واپس آگئے۔ جن لوگوں سے پاکستان جانے کے لئے کہا گیا تھا، ان میں عبدالعلیم صاحب بھی شامل تھے۔لیکن انہوں نے عقل مندی سے کام لے کر وہاں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ اُن لوگوں کا الزام تھا کہ وہ پاکستان میں بغاوت کرانا چاہتے ہیں۔ یہ الزام تو ثابت نہیں ہوا، لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خاں کو قتل کر دیا گیا۔ایک موقع پر پاکستان میں میری گفتگو بعض دوستوں سے ہو رہی تھی، وہ اصرار کر رہے تھے کہ پاکستان کو ہندستان پر فوقیت حاصل ہے۔جب میں نے ان کی خامیاں گنانا شروع کیں تو خواجہ سرناظم الدین

کے بیٹے محی الدین نے اعتراض کیا کہ ہمیں لیاقت علی خاں کے بعد لیڈر نہیں ملا۔ خواجہ ناظم الدین کے بیٹے کے منہ سے یہ اعتراف سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ اور میں نے سوال کیا: اور خواجہ صاحب؟ محی الدین نے کہا وہ بھی نہیں۔ اس وقت سے جہاں تک وزرا کا تعلق ہے، پاکستان انتشار کا شکار رہا۔

دوسری سطح پر ہندستان اور افغانستان دونوں سے پاکستان کے تعلقات کشیدہ رہے۔ ہندستان سے اختلاف کا بڑا سبب کشمیر کا مسئلہ رہا۔ اور افغانستان نے شروع ہی سے پاکستان کو دل سے منظور نہیں کیا تھا، اُس کے تعلقات ہندستان کے ساتھ ہمیشہ خوش گوار رہے۔ دوسری طرف اندرونی طور پر سِوِل اور ملٹری ہمیشہ برسرِ پیکار رہی۔

مشہور مجاہدِ آزادی اور صحافی شورش کشمیری نے مجھ سے کہا کہ جب ۱۹۶۵ء میں آپ کی فوج لاہور کے دروازے پر دستک دے رہی تھی اس وقت ایک بھی لاہور کا باشندہ لاہور کو چھوڑ کر کہیں نہیں گیا۔ میں نے کہا جب آپ (شورش) یہ کہتے ہیں تو میں اِسے تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن آپ مجھے ایک بات بتائیے، (یہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے جب جنرل ایوب خاں برسرِ اقتدار تھے) یہ آپ کے عوام ہماری فوج سے تو نہیں ڈرتے مگر اپنی فوج کے سامنے ان کی جواں مردی کہاں جاتی ہے۔ شورش نے اعتراف کیا کہ ہمارے ملک میں عوام کو حکومت کرنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ پہلے جاگیردار حکمراں تھے، پھر سِوِل سروس کے لوگ حکمراں ہو گئے اور پھر فوج برسرِ اقتدار آگئی۔ ہمارے یہاں جمہوریت کی کوئی روایت نہیں۔

پاکستان کا ایک مستقل مسئلہ فوج اور سِویلین کی باہمی کشمکش ہے۔ یہاں تک کہ آج بھی بغیر فوج کی منظوری کے سِوِل حکومت قدم نہیں اٹھا سکتی۔

میانمار اور بنگلہ دیش کی سرحد جہاں ملتی ہے وہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی ہے، اور میانمار کی حکومت ان باشندوں پر جو مذہباً مسلمان ہیں، برابر مظالم ڈھاتی رہتی ہے، اور انہیں کہیں پناہ نہیں ملتی ہے۔ نہ ہندستان میں نہ بنگلہ دیش میں، اور وہ بے چارے ملک بدر ہیں۔ آج تک انہیں سکون حاصل نہیں ہوا ہے۔

ریاض الرحمٰن شروانی

# ہماری ہمدردی کا محدود دائرہ

ہرش مندر
مترجم: پروفیسر افتخار عالم خاں

نوٹ:۔ ہرش مندر ایک آئی اے ایس افسر تھے۔ انہوں نے ۲۰۰۲ء میں گجرات فسادات کے بعد سول سروس سے استعفیٰ دے دیا تھا اور جب ہی سے انسانی حقوق اور سماجی انصاف کے ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اُن کی چار سو صفحات کی حالیہ کتاب بعنوان looking away کے چند صفحات کا ترجمہ اس مضمون کے بطور پیش خدمت ہے۔

۲۰۱۲ء کی سردیوں میں پیرا میڈیکل کی پڑھائی کرنے والی ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ کئے جانے والے وحشیانہ گینگ ریپ کے واقعے کے بعد ہندوستانی مڈل کلاس کا ایک بالکل ہی نیا روپ سامنے آیا تھا جس کے دوران نہایت زور شور کے ساتھ عوامی ہمدردی اور یکجہتی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ ملک کے دارالخلافے یعنی دہلی میں بالکل غیر متعلقہ نوجوان بھی غم و غصہ میں مبتلا ہو کر سڑکوں پر نکل آئے تھے، جس شام اس لڑکی کے مرنے کی خبر آئی تھی، میں خود اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کے ساتھ "جنتر منتر" گیا تھا۔ وہاں ایک کونے میں سیاسی پارٹیوں سے ملحق شور و غل کرنے والے نوجوانوں کا ایک گروہ موجود تھا جو ٹی وی کیمروں کے سامنے دیوانہ وار نعرے بازی کرنے میں مشغول تھے۔

لیکن جس جگہ اصل احتجاج کیا جا رہا تھا وہاں بہت بڑی تعداد میں نوجوان خاموشی سے اپنی روشن موم بتیوں کے ساتھ متفکرانہ انداز میں بیٹھے اس جوان لڑکی کی موت کا سوگ منا رہے تھے جس کی اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات تھیں جیسے پیرا میڈیکل کے سلسلے کے پیشے کی تعلیم حاصل کرنا یا پھر اپنے دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنے جانا، وہ ہماری اپنی بیٹی بھی ہو سکتی تھی وہ آپ کی بھی، بہن یا بیٹی ہو سکتی تھی۔ اس پر کیا گیا وہ وحشیانہ ظلم۔ اور اس کو اس طرح بغیر کسی وجہ یا خطا کے، ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دینا ہمارا اپنا المیہ بن گیا تھا۔ ہزاروں لوگوں نے اس بچی کا نام جانے، یا صورت دیکھے بغیر، اس کے غم کو اپنا غم بنا لیا تھا۔

لیکن اس دن وہاں گزارے اس مختصر وقت میں مجھے اپنی ہمدردی کے دائرے کی محدودیت کا بھی شدید احساس ہوا تھا، کیوں کہ اس طرح کے مظالم کی شکار دوسری لا تعداد عورتیں اور لڑکیاں ہمارے آس پاس موجود ہوتی ہیں جن کے لیے ہم کبھی سڑکوں پر کوئی مارچ نہیں کرتے ہیں اور نہ ہم ان کی یاد میں موم بتیاں جلاتے ہیں۔ وہ ہمارے مڈل کلاس کی ہمدردی کے دائرے سے ہمیشہ باہر رہتی ہیں۔

شہروں میں جہاں ہم رہتے ہیں، سب سے زیادہ غیر محفوظ یہ ہی سڑکوں پر رہنے والی بے گھر عورتیں اور لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ہم نے جب اپنا سب سے پہلا ''عورتوں کا گھر'' شروع کیا، اس میں ہم نے وہاں رہنے والی عورتوں سے سوال کیا تھا کہ ان کی زندگی میں وہ کون سی سب سے بڑی تبدیلی ہے جو یہاں اس گھر میں آنے کے بعد واقع ہوئی ہے؟ اس سوال کا ایک عورت نے یہ جواب دیا تھا کہ پچھلے سترہ (۱۷) سالوں میں یہاں آنے کے بعد میں پہلی مرتبہ رات میں بے فکری کے ساتھ سو سکی تھی، کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ یہاں میرے ساتھ کوئی جسمانی چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گا۔ اس کے علاوہ یہاں بہت سی ایسی لڑکیاں تھیں جن کی جنسی پیشہ کروانے یا گھریلو کام کاج دلوانے کے لیے خرید وفروخت کی گئی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر لڑکیوں نے بتلایا تھا کہ وہ اپنے گھر میں کئے جانے والے مظالم کی وجہ سے اپنے گھروں سے بھاگ گئی تھیں۔ انہیں میں سے بہت سوں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ خود ان کے والدین ان کے ساتھ زنا کاری جیسے جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔ ہماری ہمدردی کے دائرے سے وہ چھوٹی ذاتوں کے افراد بھی باہر رہتے ہیں جن کی عورتوں کا جنسی استحصال صرف اس لیے کیا جاتا ہے کہ مردان پر اپنا استحقاق ہمیشہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

راجستھان میں ۱۹۹۲ء میں ایک نچلی ذات کی عورت ''بھوانی دیوی'' کا بطور سرزنش ''اجتماعی ریپ'' کیا گیا تھا۔ اس کی خطا صرف یہ تھی کہ وہ ایک بال بیاہ (یعنی بچے کی شادی) کی مخالفت کر رہی تھی۔ اس واقعے کے بعد وہ اکیلی تن تنہا انصاف کی لڑائی لڑتی رہی تھی، اس کو بار بار پولیس، وکلاء اور ججوں کے سامنے شرمندہ اور بے عزت کیا جاتا تھا اس کے گاؤں میں اس کو اور اس کے شوہر کو برسوں تک ''ذات باہر'' کر کے بائیکاٹ کیا گیا تھا۔

تقریباً چودہ سال پہلے مہاراشٹر کے ایک گاؤں ''کھیر لانجی'' میں ایک دلت خاندان کی ساری عورتوں کو پُر تشدد زنا کاری کے بعد قتل کر دیا گیا تھا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اعلیٰ ذات کے لوگوں کو یہ امر برداشت نہیں ہو رہا تھا کہ یہ خاندان نسبتاً خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگا تھا۔ دلت عورتوں کے خلاف جنسی تشدد کی روایت نسلوں سے جاری ہے بلکہ صدیوں سے قائم ہے۔

۲۰۰۲ء میں گجرات میں مسلم خواتین کے ساتھ بھی جنسی تشدد کے نہایت مکروہ اور بھیانک واقعات سامنے آئے تھے، عورتوں کی انکوائری کمیٹی کو متاثرین کے ایک کیمپ میں ایک چھوٹا لڑکا ملا تھا جو اس بات پر مصر تھا کہ اسے معلوم ہے کہ ریپ کیسے ہوتا ہے۔ جب ممبران نے اس سے بتلانے کو کہا تو اس نے کہا تھا ''ریپ میں عورتوں کو ننگا کر کے جلایا جاتا ہے''۔ ہر فرقہ وارانہ فساد میں زنا کے واقعات بہت پابندی سے دہرائے جاتے ہیں۔ ابھی حال میں یعنی ۸-۲۰۰۷ء میں اڑیسہ کے کھنڈامل میں فرقہ وارانہ تشدد کے دوران قبائلی عورتوں اور راہباؤں کے ساتھ بھی یہ عمل دہرایا گیا تھا۔

۲۰۰۴ء میں سکورٹی فورسیز کے ذریعہ منی پور میں منورما نام کی ایک جوان عورت کے زنا کاری کے بعد قتل کئے جانے کے واقعہ نے وادی کی عورتوں کو غم وغصہ میں اس قدر مشتعل کیا کہ انہوں نے اس کے خلاف ایک ایسا مظاہرہ کیا تھا جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ یہ عورتیں بڑی تعداد میں فوجیوں کے کیمپ کے باہر جا کر ننگی کھڑی ہوگئی تھیں اور اصرار کر رہی

تھیں کہ ان کے ساتھ زنا کیا جائے۔

مسلح تنازعات کے ہر مقام پر اور ہر دور میں وردی میں ملبوس جوانوں کے ذریعہ کی گئی زنا کی وارداتیں کم نہیں ہیں۔ کشمیر کے گاؤں ''کوان لوشیاہ'' کے لوگ ۱۹۹۲ء میں سپاہیوں کے ذریعہ کیے گئے ''ماس گینگ ریپ'' کے خلاف انصاف کے لئے قانونی لڑائی آج تک لڑ رہے ہیں، حالانکہ اس واقعہ کو ۲۰ سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور صوبہ کے انسانی حقوق کے کمیشن نے بھی ان الزامات کی تصدیق کر دی ہے۔

ان جرائم کے متاثرین سے ہمدردی کرنے میں ظاہر ہے ہمیں کوئی دقت نہیں ہوئی ہے۔ دراصل ہم کو سب سے بڑی دقت ان مجرمانہ حرکت کرنے والوں سے کسی بھی طرح کی ہمدردی کرنے میں پیش آتی ہے۔ سوچئے ان کے ان گھناونے جرموں کی مذمت کرنے کے ساتھ ہی کیا وہ خود بھی ہماری تھوڑی سی ہمدردی اور رعایت کے لائق نہیں ہیں؟ اب اسی ۱۷ سال کے لڑکے کو لے لیجئے جس نے کہا جاتا ہے کہ ۱۶ ردسمبر کی رات کو (اس بچی کے ساتھ) نہایت ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک کیا تھا (حالانکہ بعد کی تفتیش میں یہ الزام صحیح ثابت نہیں ہوا تھا) یہ لڑکا ۱۳ سال کی عمر میں اپنے گھر سے بھاگ گیا تھا۔ اس کی اپنے گھر سے بھاگنے کی کیا وجوہات تھیں، یہ ہم نہیں جانتے ہیں حالانکہ میں اور میرے دوسرے ساتھی جو اس طرح کے بچوں کی دیکھ ریکھ کا کام ایک عرصے سے کر رہے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ ان سب بچوں کی کہانیاں یکساں ہوتی ہیں۔ یعنی بچپن میں کئے جانے والے مظالم۔ شرابی باپ کے ذریعہ ان کا استحصال، پھر وہ سڑکوں پر پولیس اور دوسرے بالغ افراد کے ذریعے پٹتے، گالیاں کھاتے اور دوسرے مظالم سہتے ہوئے بڑے ہوتے ہیں۔ ان کے آس پاس کوئی ایسا بڑا اور ہمدرد شخص نہیں ہوتا ہے جو ان کی دیکھ ریکھ کرے یا ان کو تحفظ مہیا کروائے یا ان پر یقین کرے اور انہیں صحیح راستہ دکھلائے اور ان کو اچھائی اور برائی میں تمیز کرنا سکھلائے۔ ہمارا تجربہ بتلاتا ہے کہ اگر وقت پر ان بچوں کو پیار اور محبت مل سکے تو یہ سڑکوں پر آوارہ پھرنے والے، بگڑے ہوئے کمسن بچے دوبارہ واپس ایک نیک انسان بن سکتے ہیں۔

اس لڑکے کے علاوہ جو دوسرے لوگ اس جرم میں ملوث تھے ان ہی کو لے لیجئے۔ ان نوجوانوں کے آس پاس ہم نے چمک دمک کی ایک اعلیٰ اور جذبات انگیز دنیا بنا رکھی ہے، ایک ایسی سحر انگیز دنیا جس میں وہ اپنا سارا وقت گزارتے ہیں، لیکن ہمیشہ اس سے دور رکھے جاتے ہیں۔ یہ وہ نوجوان ہیں جو آرزوئیں اور خواہشیں تو رکھتے ہیں لیکن انہیں کبھی پورا نہیں کر سکتے ہیں، ظاہر ہے زندگی کی ناکامی کا یہ المیہ ہمیشہ بدمزاج، مضطرب اور بے چین رکھتا ہے۔ ہم ان غریبوں کے اندر موجود اس خطرناک جذباتی دباؤ کو نہیں دیکھ سکتے ہیں، جس کے ساتھ یہ شہروں کی گلیوں میں اپنا وقت گزارتے ہیں۔ لیکن یہ صورت حال ایک لمحہ کے لیے بھی ان گھناؤنے جرائم کے جواز کے بطور پیش نہیں کی جاسکتی ہے۔ یہ تو دسمبر ۲۰۱۲ء کی رات کو ہونے والے جرم میں ہماری اور آپ کی بنائی ہوئی اس دنیا کی شرکت کی غمازی کرتی ہے جس کو ہم نے اپنے آرام اور آسائش کے لیے نہایت بے شرمی اور بے حسی کے ساتھ سجا رکھا ہے۔

☆☆☆

اہل کتاب-۴

# میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے! (علامہ اقبال)

## سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا (اقبال)

عابد رضا بیدار

علامہ اقبال کا اردو کا پہلا مجموعہ کلام جو ان کی نگرانی اور اجازت سے چھپا اس کی اشاعت ۱۹۲۴ء میں ہوئی، یعنی وفات سے ۱۴/ ۱۵ برس قبل۔ یہ نظم جس کا ذکر آگے آتا ہے، اس پہلے مجموعہ کلام میں شامل ہے، اس مجموعہ کا نام **بانگ درا** ہے، جس میں علامہ اقبال کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے **"زہد اور رندی"**۔ وہ شروع اس طرح سے ہوتی ہے: ع ایک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی

یہ نظم آگے بڑھتی ہے تو علامہ فرماتے ہیں کہ مولوی صاحب اپنے مریدوں سے علامہ کے بارے میں کہہ رہے تھے کہ: ع سُنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا

علامہ کا اصل مصرعہ تو اسی طرح ہے؛ اور یہ اس نظم کے **وزن** کی مجبوری ہے جس کے سبب علامہ کہنا تو چاہ رہے تھے : ہندوؤں کو وہ کافر نہیں سمجھتے۔ اس نثری جملے کو وزن میں لانے کے لئے ان کی مجبوری تھی کہ پہلے "کافر نہیں" کہا۔ پھر۔ لکھا "ہندو کو سمجھتا"۔ آسان زبان میں اور وزن کو برقرار رکھتے ہوئے، کوئی حرف نہیں اگر اسے ایسے ادا کیا جاتا کہ **ہندو وہ کافر نہیں کہتے**۔ اسی لئے ہم نے اقبال ہی بات الفاظ کو آگے پیچھے کر کے کو آسان زبان میں عنوان بنا دیا ہے، اقبال سے معذرت کے ساتھ۔ اور بات یوں ٹھہری کہ:

ع سُنتا ہوں کہ ہندو کو کافر نہیں کہتا اقبال، کہ ہے قُمریِ شمشادِ معانی

تو یہ نظم اور آگے بڑھتی ہے۔ اس نظم کے بعض مصرعے/ شعر پڑھتے جایئے:

اک مولوی صاحب کی سُناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دِکھانی
کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی
منظور تھی تعداد مُریدوں کی بڑھانی

مُدّت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پُرانی
حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پُوچھا
اقبال، کہ ہے قمریِ شمشادِ معانی
پابندیِ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟
گو شعر میں ہے رشکِ کلیم ہمَدانی
**سُنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا**
**ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی**
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اُڑانی
گانا جو ہے شب کو تو سحَر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھُلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سُنا اپنے مُریدوں سے ہے مَیں نے
بے داغ ہے مانندِ سحَر اس کی جوانی
رِندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف
پُوچھو جو تصوّف کی تو منصور کا ثانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھُلتی
ہو گا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی
القصّہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے
تا دیر رہی آپ کی یہ نغز بیانی
اس شہر میں جو بات ہو، اُڑ جاتی ہے سب میں
مَیں نے بھی سُنی اپنے اَحبّا کی زبانی
گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
مَیں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی

مجھ کو بھی تمنّا ہے کہ 'اقبال' کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی 'اقبال' سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

•

توحید کا خالص اور نکھرا ہوا تصور مہابھارت کے نغمات میں جا بجا بکھرا ملتا ہے، بس اقبال کی طرح بلکہ مینار نو کی طرح بکھراؤ کو سمیٹ کے نکھار کے صاف کر کے سامنے لانا ہے۔

علامہ اقبال کے کلام بانگ درا میں ایک نظم **''آفتاب''** عنوان سے موجود ہے، اور جہاں ایک نوٹ میں یہ بھی لکھا ہے گایتری منتر کا ترجمہ ہے۔ جب اسے پہلی بار حیدرآباد کے عبدالرزاق راشد صاحب نے اپنے مرتبہ مجموعہ ''کلیات اقبال'' میں شائع کیا تو علامہ کے اصل متن میں کچھ اس قسم کی بات بھی مذکور تھی کہ مہابھارت کا یہ گایتری منتر خالص توحید کا راگ ہے اور سورج یا آفتاب سے مراد وہ نور ہے جسے ہم خدا کہتے ہیں۔ یہ توحید کا زبوری نغمہ کیسا خوبصورت اظہار ہے توحید خالص کے مختلف جہات کا، اس کا پورا متن ملاحظہ فرمائیں:

اے آفتاب! روح و روانِ جہاں ہے تُو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تُو
باعث ہے تُو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا
قائم یہ عُنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے
اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے

ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تُو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تُو
تیرا کمال ہستیِ ہر جاندار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تُو
زائیدگانِ نُور کا ہے تاجدار تُو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری
(ترجمہ گایتری)

●

علامہ، رام چندر جی کو امامِ ہند کے لقب سے یاد کرتے تھے، ان کی ایک اور نظم بانگ دراہی میں ''رام'' کے عنوان سے ہے، جسے قدیم کلام نے غالباً ''امام ہند'' کا نام دیا تھا، اور جس میں علامہ نے کہا ہے کہ ہندستان کا جام شراب حقیقت سے لبالب بھرا ہوا ہے، ایسا کہ یورپ کے سب فلسفی ہندستان کے حقیقت رس افکار کے آگے سرنگوں ہیں۔ ہندی فلسفہ کی فکر رسا ایسی بلندیوں پر پہنچ چکی تھی، جن بلندیوں تک آسمان بھی نہیں پہنچا تھا۔ یہ عظمت تھی ہندستان کے بام کی، اس کی اونچائی کی! ہمارے اس دیس میں ہزاروں ہزار فرشتہ صفت ایسے گزرے ہیں جن کے دم سے ساری دنیا میں ہندستان کا نام مشہور ہے۔

اور ہندستان کے ان بڑوں میں رام کے وجود پر ہندستان کو ناز ہے، وہ رام جنھیں اہل نظر امام ہندستان سمجھتے ہیں، یہ رام ہی کا اعجاز ہے، انھیں کے جلائے ہوئے چراغ ہدایت کا معجزہ ہے جس سے ہندستان کی شام بھی سارے عالم میں سحر سے بھی زیادہ روشنی بکھیر رہی ہے۔

علامہ کی وہ اصل نظم ملاحظہ ہو:

## رام

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خطہ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند

●

کافر اور مومن میں اقبال نے جو فرق کیا ہے وہ ان سے پہلے اس طور سے کسی نے نہیں سوچا تھا۔ وہ کہتے ہیں کافر تقدیر کا بندہ ہوتا ہے، تقدیر ساز نہیں ہوتا، تقدیر کی ماتحتی میں گزارتا ہے، مجبور اور بے کس۔ اور ایسا بندہ جو خود اپنا تقدیر ساز نہ ہو، وہ مسلمان نہیں ہوتا؛ مسلمانی اس کے لئے ہتک کا باعث ہے۔ دوسری طرف مومن ہوتا ہے: ایمان والا، یقین والا: اللہ پر بھرپور یقین رکھنے والا:

یقین اللہ مستی خود گزینی
یقین مثل خلیل آتش نشینی

بس شرط یہ ہے کہ وہ مومن ہو، ایمان والا، یقین والا! پھر وہ خود تقدیر بناتا ہے، وہ تقدیر کا کھلونا نہیں بنتا، تقدیر اس کا کھلونا بنتی ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے: بتا، تیری رضا کیا ہے

جو تلوار پہ بھروسہ کرے وہ اپنے اعتماد میں کسی اور کو شریک کر لیتا ہے، وہ اعتماد اور یقین جو مومن صرف اللہ پر رکھتا ہے، جو تلوار پر بھروسہ کرے وہ مومن کہاں رہا، بھروسہ تو ایک ہی پر ہوتا ہے، اگر یہ بھروسہ ڈگمگا گیا تو وہ کافر ہو گیا۔ دوسری طرف مومن ہے اللہ پر بھروسہ رکھنے والا! اس کے لئے تلوار ہو یا کوئی بھی اور ہتھیار یا کوئی بھی اور وسیلہ، ذریعہ، بچاؤ کے لئے یا حملے کے لئے کوئی ہتھیار: مومن کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اللہ کا سپاہی ہو کر وہ کسی وسیلے پر بھروسہ کرے؛ اس کی طاقت تو تیغ و تبر نہیں ہوتے، اللہ ہوتا ہے صرف اللہ! یہاں تک پہنچتے پہنچتے پھر علامہ کا قلم بھرپور وار کرتا ہے جب وہ کہتے ہیں، مسلمان اگر کافر ہو گیا تو پھر اسکے لئے نہ شاہی کی کوئی اہمیت ہے نہ فقیری کا کوئی غم: وہ تو شاہی میں فقیری کرتا ہے اور فقیری میں شاہی؛ کافر مسلمان کو شاہی یا فقیری سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے: اس کے لئے شاہی شاہی ہے اور فقیری فقیری! وہ شاہی میں تو جی سکتا ہے لیکن شاہی کھو جائے تو فقیری میں اس کی سانس

گھٹی جاتی ہے۔ ادھر مومن ہے جسے شاہی سے کچھ لینا دینا نہیں وہ تو بس اللہ میں جیتا ہے فقیری تو اس کی سانس ہے، آتی جاتی سانس۔ اور اسی فقیری میں وہ ایسے گزارتا ہے جیسے کہ کوئی شاہی میں گزارے۔ یہ ہے مومن کی شان اور وہ رہی کافر کی پہچان: مومن کافر کیا ہوتا ہے اور کافر مومن کیا ہوتا ہے ان چھ مصرعوں میں اقبال نے بڑی خوبصورتی سے ان دونوں کا فرق بتا دیا ہے۔

اب اس کو سامنے رکھتے ہوئے علامہ کی کسوٹی پر مسلمان کافروں کی پہچان بھی کر لیں، پھر کافر مسلمانوں کی شناخت میں بھی آسان ہو جائے گی۔ آگے بڑھ کے، ذرا اور آگے قدم رکھتے ہوئے علامہ کے ان اشعار کی روشنی میں اس امر کی پہچان بھی مشکل نہ رہے گی کہ قرآن مجید نے جو اہل حق اور اہل کتاب کی پہچان بتائی ہے اور جن کی تعلیمات کی طرف اشارہ کیا ہے، قرآن مجید کی بتائی ہوئی پہچانوں میں اہل ہند اپنی کتابوں کے پاک صاف متون کی روشنی میں پورے پورے پہچان میں آتے ہیں یا نہیں۔ علامہ کے اشعار ملاحظہ ہوں:

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی
کافر ہے تو تلوار پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

●

علامہ کا ایک شعر ملاحظہ ہو جس میں اوپر کہی ہوئی باتوں کو بالکل صفائی سے کہہ دیا ہے۔ اس شعر میں انھوں نے اپنے بڑے پیارے لفظ یقین کی جگہ بار بار دہرائے جانے والے لفظ عشق کا استعمال کیا ہے، اور ایسے کیا ہے کہ عشق یقین بن جاتا ہے ایمان بھی، وہ عشق جس کے سہارے کافر بھی مسلمان ہے، اور کفر بھی مسلمانی! یہی وہ عشق ہے جس کے بغیر وہ شخص جو خود کو مسلمان کہتا ہے اور آس پاس لوگ بھی مسلمان سمجھتے ہیں، اس عشق کے بغیر، اس یقین و ایمان کے بغیر وہ صرف اور صرف کافر ہے، زندیق ہے۔ فرماتے ہیں:

اگر ہے عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

●

شاعر اقبال کو تو آپ نے پڑھ لیا، اب چلتے چلتے فلسفی اقبال کو بھی پڑھ لیں، جس نے اپنے بارے میں لکھا تھا : میں اصل کا خاص سومناتی / آبا مرے لاتی و مناتی! اور لکھا تھا : برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز است!

وہ لکھتے ہیں :

''ہندو قوم کے دل و دماغ میں عملیات و نظریات کی ایک عجیب طریق سے آمیزش ہوئی ہے اس قوم کے موشگاف حکمانے قوت عمل کی حقیقت پر نہایت دقیق بحث کی ہے۔ اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انا کی حیات کا یہ مشہود تسلسل جو تمام آلام و مصائب کی جڑ ہے، عمل سے متعین ہوتا ہے، یا یوں کہئے کہ انسانی انا کی موجودہ کیفیات اور لوازمات اس کے گذشتہ طریقِ عمل کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اور جب تک یہ قانونِ عمل اپنا کام کرتا رہے گا، وہی نتائج پیدا ہوتے رہیں گے۔ انیسویں صدی کے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کا ہیرو فوسٹ، جب انجیل یوحنا کی پہلی آیت میں لفظِ کلام کی جگہ لفظِ عمل پڑھتا ہے (''ابتدا میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ اور کلام ہی خدا تھا'') تو حقیقت میں اس کی دقیقہ رس نگاہ اُسی نکتے کو دیکھتی ہے جس کو ہندو حکمانے صدیوں پہلے دیکھ لیا تھا۔ اس عجیب و غریب طریق پر ہندو حکماء نے تقدیر کی مطلق العنانی اور انسانی حریت یا بالفاظ دیگر جبر و اختیار کی گتھی کو سلجھایا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ فلسفیانہ لحاظ سے ان کی جدت طرازی داد و تحسین کی مستحق ہے۔ اور، بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ ایک بہت بڑی اخلاقی جرأت کے ساتھ ان تمام فلسفیانہ نتائج کو بھی قبول کرتے ہیں جو اس قضیہ سے پیدا ہوتے ہیں: یعنی یہ کہ جب انا کی تعیین عمل سے ہے تو انا کے پھندے سے نکلنے کا ایک ہی طریق ہے، اور وہ ترکِ عمل ہے۔ یہ نتیجہ انفرادی اور ملی پہلو سے نہایت خطرناک تھا اور اس بات کا مقتضی تھا کہ کوئی مجدد پیدا ہو جو ترکِ عمل کے اصلی مفہوم کو واضح کرے: بنی نوع انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب پیرائے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکار کیا کہ ترکِ عمل سے مراد ترکِ کلی نہیں ہے۔ کیوں کہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے۔ بلکہ ترکِ عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دل بستگی نہ ہو۔ سری کرشن کے بعد سری رام نوج بھی اسی رستے پر چلے مگر افسوس ہے کہ جس عروس معنی کو سری کرشن اور سری رام نوج بے نقاب کرنا چاہتے تھے سری سنکر کے منطقی طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا، اور سری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم رہ گئی''۔ (مثنوی اسرار خودی کا فراموش شدہ ایڈیشن، مرتبہ ڈاکٹر شائستہ خاں، صفحہ ب-ہ، مکتبہ جامعہ، ۱۹۹۲: کے دیباچہ سے مقتبس)۔

اقبال ابھی سری کرشن کی بات کر رہے تھے۔ مگر فی الحال انھوں نے گوتم کے بارے میں جو کچھ کہا ہے تھوڑا سا اسے بھی سن لیں (علامہ نے گوتم کو گوہرِ یک دانہ نام دیا تھا)، بلکہ پہلے علامہ کو سن لیں اور پھر گوتم سے

انسپریشن پائی ہوئی ہدایات کو بھی، جو دھمپد اور ست نپات میں محفوظ ہیں :

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی
آہ! بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکار اُس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفے پر ناز تھا
شمعِ حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارشِ رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی
آہ! شُودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے
برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

دنیا کے عظیم مذاہب میں سے ایک ''بدھ مت'' جس کے بانی نے بیماری، دکھ، بڑھاپے اور موت سب کا علاج پالیا تھا، صرف ایک معمولی سے لفظ تیاگ میں : ہر خواہش کو ترک کرنا اور ہر ہوس کو مارنا، یہی نروان کی کنجی ہے۔ اس عظیم مذہب کی دو مقدس کتابوں میں سے منتخب جواہر پارے ملاحظہ ہوں، جن سے اس مذہب کی عظمت کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے ہندستان بھی کتنا عظیم ہے جس نے گوتم جیسے عظیم کو جنم دیا۔ پھر یہ کیسا بدنصیب دیس بھی ہے کہ آج تک مذہب کی سچی اسپرٹ سے ہمکنار نہیں ہوسکا ہے۔ یہ انگریزی سے ترجمہ ہے:

● ہم جو کچھ بھی ہیں وہ نتیجہ ہے اس کا جو کچھ کہ ہم نے سوچا اور جس کے ہم نے خواب دیکھے۔

● نفرت کبھی بھی نفرت سے ختم نہیں ہوتی۔ نفرت صرف محبت سے ختم ہوسکتی ہے۔

● خوبصورت، رنگین، بے خوشبو کا پھول۔ بس ایسے ہی ان لوگوں کی باتیں سمجھ لو جو بہت اچھی باتیں کرتے ہیں مگر کام اتنے اچھے نہیں کرتے۔ وہ جو اپنی باتوں کی طرف اپنے کاموں میں بھی اچھے ہیں ان پھولوں کی طرح ہیں جو شوخ رنگ بھی ہیں، حسین بھی، خوشبودار بھی۔ ایسے پھولوں کی خوشبو، صندل کی لکڑی کی مہک، ہوا کی مخالف سمت میں اڑ کر نہیں جاسکتی۔ لیکن اچھے لوگوں کی خوشبو ہوا کی مخالف سمت میں بھی پہنچ جاتی ہے۔

● خوشبوؤں میں سب سے اچھی بھلے کام کی خوشبو ہے۔

● اگر کسی مسافر کو اپنے سے بہتر یا کم سے کم اپنے برابر سمجھ بوجھ والا ساتھی نہ مل سکے تو بھلائی اسی میں ہے کہ تنہا ہی سفر کاٹ دے۔ بیوقوف کا ساتھ کوئی ساتھ نہیں۔

(اقبال کہتے ہیں: من از طریق نہ پرسم، رفیق می جویم کہ گفتہ اند نخستیں رفیق و بعد طریق)

● میری یہ دولت! یہ میرے بچے!! احمق ایسے خیالوں میں پھنسے رہتے ہیں : انسان خود بھی اپنا نہیں، بچے اور پیسے کا کیا سوال۔

● اگر کوئی احمق کسی عقلمند کا ساتھی بن جائے تو ساری عمر میں وہ صرف اتنا سا سچ سمجھ پائے گا جیسے چمچے کو شوربے کا مزہ آجائے۔ اور اگر کسی ذہین آدمی کا کسی عقلمند سے ایک منٹ کا بھی ساتھ ہو جائے تو وہ سچ کو پالے گا بالکل ایسے ہی جیسے زبان شوربے کا مزہ پالے۔

● جیسے ایک ماں اپنی زندگی کی قیمت پر اپنے بچے کی نگہداشت کرتی ہے۔ ایسے ہی ہر ایک کو سارے انسانوں کے سلسلے میں ایک بے نہایت مزاج بنانا چاہئے، جاگتے سوتے چلتے پھرتے، جب تک کہ وہ بیدار ہے اسے اپنے دماغ کا ایک ایک شمہ اسی میں لگا دینا چاہئے۔

● پوچھنے والے نے پوچھا: (۱) دنیا میں سب سے بہتر ملکیت کیا ہے، (۲) کونسا کام ہے جسے خوش اسلوبی سے کیا جائے تو خوشی ہو، (۳) سب سے زیادہ شیریں چیز کیا ہے اور (۴) زندگی گذارنے کا کونسا طریقہ سب سے بہتر ہے؟ تو بھگوت نے جواب دیا: (۱) عقیدہ دنیا کی عزیز ترین متاع ہے۔ (۲) دین اس کے حق کے مطابق برتا جائے تو خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ (۳) سچ سے زیادہ شیریں چیز اور کوئی نہیں، اور (۴) زندگی گزارنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہوش مندی کے ساتھ گزاری جائے۔

(شعور منزل مقصود بھی ہے شرط سفر ہجوم راہرواں کارواں نہیں ہوتا) (انور معظم)

● ایسا دین دار جو گرہستی کی زندگی گزارتا ہے اور سچ، انصاف، مضبوطی اور وسیع النظری کی خصوصیات کا حامل ہے، اسے مرتے وقت کوئی پریشانی نہ ہوگی۔

● کبھی چٹان کو ہٹتے دیکھا ہے : بڑے لوگ نہ الزام پر کانپنے لگتے ہیں نہ تعریف پر پھولتے ہیں۔

● برائی گوشت کھانے میں نہیں، برائی اس میں ہے کہ زندہ چیزوں کو برباد کیا جائے، برائی مار ڈالنے میں ہے، برائی کاٹنے میں ہے، باندھنے میں ہے، چرانے میں ہے، جھوٹ بولنے میں ہے، دھوکہ اور فریب میں ہے، فضولیات میں پڑنے میں ہے، دوسروں کی عورتوں پر نظر رکھنے میں ہے۔

● جس کا ہاتھ زخمی نہیں وہ اپنے ہاتھ سے زہر بھی چھو سکتا ہے۔

☆☆☆

# پروفیسر مختارالدین احمد
## (تصانیف کی روشنی میں)

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

حضرت ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب ایک بڑے محقق، ایک ماہر غالبیات، فن خطوط نگاری کے راز داں، فن تحقیق کے ماہر اور اردو کے بڑے محقق ادباء میں سے تھے۔ انہوں نے عربی، فارسی اور اردو میں تصانیف کا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ خود اپنے خطوط بھی اپنی زندگی میں شائع کردیئے ہیں اور دوسرے علماء کے خطوط کی بھی تدوین کی ہے۔

اس مقالہ میں میرا مقصد پروفیسر مختار الدین احمد کی تصانیف کا تفصیلی ذکر کرنا ہے۔ میں نے کسی مقالہ میں حضرت ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کا تفصیلی مطالعہ نہیں کیا اس لیے سب سے پہلے مجھے ان کی تصانیف کی ایک فہرست پیش کرنا ہے۔ یہ واضح رہے کہ حضرت ڈاکٹر صاحب نے تحقیق وتدوین کتب قدیم پر اور خطوط پر بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے مگر حضرت ڈاکٹر صاحب نے خود کوئی کتاب نہیں لکھی۔ ان کا سارا کام تحقیقی ہے۔ ان کی کتاب بابائے اردو عبدالحق پر ہے مگر وہ انتساب مشتبہ ہے۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے محقق تھے۔ ان کا میدان تحقیق تھا اس میں وہ بے نظیر تھے۔ میں ''مختار نامہ'' کی مدد سے یہ فہرست ان کی تحقیقی کتابوں کی پیش کرتا ہوں۔ چونکہ یہ تحقیقی کتابیں ہیں اس لئے ان پر زیادہ لکھا نہیں جاسکتا۔ ان کتابوں میں شاہکار تصنیف وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر پروفیسر علامہ عبدالعزیز میمنی کی نگرانی میں حضرت ڈاکٹر صاحب کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے تفویض کی تھی۔ اس کتاب کا نام ہے الحماسۃ البصریۃ، اس کے متعدد ایڈیشن عرب ممالک سے شائع ہو چکے ہیں اور جب بھی کوئی نیا ایڈیشن آتا تو حضرت ڈاکٹر صاحب مجھ کو وہ ایڈیشن لاکر دکھاتے تھے۔ ان کے جمع کردہ خطوط کا ذخیرہ بہت بڑا ہے۔ یہاں ان کی کتابوں کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے:

۱- خطوط اکبر، علی گڑھ ۱۹۵۱ء

۲- احوال غالب، ۱۹۵۳ء (اس میں حضرت ڈاکٹر صاحب کا اپنا ایک مقالہ ہے باقی دوسروں کے مقالات ہیں)

۳- نقد غالب (اس میں بھی حضرت ڈاکٹر صاحب کا ایک مقالہ ہے باقی دوسرے ناقدین کے مقالے ہیں)

۴- تذکرہ شعرائے فرخ آباد، انجمن ترقی اردو ۱۹۵۶ء

۵- تحقیق میر دہلی از ریاض الدین، مجلس علمی دہلی ۱۹۵۶ء

۶- تحقیق کربل کتھا از فضلی، ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ، ۱۹۶۵ء
۷- گلشن ہند تذکرہ شعرائے اردو از حیدر بخش حیدری، مجلس علمی دہلی ۱۹۷۱ء
۸- تذکرۂ اردو مفتی صدر الدین آزردہ، علمی مجلس دہلی، ۱۹۷۰ء
۹- دیوان حضور عظیم آبادی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، ۱۹۷۷ء
۱۰- بابائے اردو عبد الحق

## مقالات پروفیسر مختار الدین احمد:

حضرت ڈاکٹر صاحب کے مقالات بہت زیادہ ہیں مگر اکثر مکتوبات ہیں طویل مقالے بہت کم ہیں انہوں نے کسی خاص علمی معاملہ میں مکتوب لکھا ہے وہ مقالہ ہی ہے۔ ایسے مکتوبات کی کثرت ہے مثلاً خط کسی بادشاہ کامل گیا یا کسی بڑے عالم کامل گیا اس پر ایک مختصر نوٹ لکھ کر اس کو معاصر پٹنہ میں یا معارف اعظم گڑھ میں یا کسی موقر مجلہ میں شائع کرادیا تو اس کی اہمیت ہو جاتی ہے مگر وہ علمی مقالہ کی اہمیت نہیں رکھتا اس طرح کے مکاتیب کا ایک دفتر ہے جو حضرت ڈاکٹر صاحب نے تیار کر دیا ہے ان مکتوبات کی تعداد ۵۶ ہوئی۔ میں نے ان کو نظر انداز کر کے صرف ان کے مقالات کی ایک فہرست ''مختار نامہ'' کو ڈاکٹر عطا خورشید اور مہر الٰہی کی مدد سے تیار کیا ہے مختار نامہ کے مرتبین نے تشریحی نوٹس لکھ کر کتاب کی ضخامت بڑھا دی ہے اور تعجب ہے کہ تصانیف پر نمبر نہیں لگایا ہے نہ مقالات پر اور نہ مکتوبات پر یعنی اس کتاب مختار نامہ کو پڑھ کر یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ حضرت ڈاکٹر صاحب کی اردو کتابیں کتنی ہیں۔ عربی کتابیں کتنی ہیں اور فارسی کتابیں کتنی ہیں اس لیے کہ ان کتابوں پر نمبر نہیں ہیں۔ آپ گن کر شمار کر لیجئے۔ یہ تصانیف دوسروں کی کتابوں پر تحقیقات ہیں۔ حضرت ڈاکٹر صاحب ایک بڑے محقق تھے۔

## فہرست مقالات:

۱- حیات ملک العلماء، مولانا ظفر الدین قادری رضویؒ۔ ادارہ معارف نعمانیہ ۱۹۹۳ء
۲- ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے خطوط۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۹ء
۳- ڈاکٹر ذاکر حسین کے خطوط (یہ الگ الگ مجموعے ہیں) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۲۰۰۰ء

یہاں تک اردو تصانیف کا ذکر مکمل ہو گیا۔ اب عربی تصانیف کا ذکر شروع ہوتا ہے۔

۱- دیوان شعر الامیر مؤدالادلہ اسامہ بن منقذ الکنانی الشزری، ۱۹۹۱ء
۲- فضائل من اسمہ احمد و محمد، علی گڑھ ۱۹۶۰ء
۳- المختار من شعر ابن الدمنہ، علی گڑھ ۱۹۶۲ء
۴- الحماسۃ البصریۃ مصنفہ صدر الدین علی بن ابی الفرج البصری (متوفی ۶۵۴ھ) شائع کردہ دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد ۱۹۶۴ء۔ یہ حضرت ڈاکٹر صاحب کے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے۔

۵- رسالۃ المبرد النحوی، دہلی۔۱۹۶۸ء
۶- القصیدۃ الدالیۃ للاعشی الکبیر مع شرح الشیزری (یعنی مسلم بن محمود الشیزری،) علی گڑھ ۱۹۹۶ء
۷- کتاب مجالس المیمنی، العلامہ الشیخ عبدالعزیز المیمنی۔ علی گڑھ ۱۹۸۶ء
۸- حضرت ڈاکٹر مختار الدین نے اپنے استاذ علامہ عبدالعزیز میمنی پر المجمع العلمی العربی الھندی کے دو خاص نمبرات عربی میں شائع کیے ہیں۔

(۱) حضرت ڈاکٹر صاحب کے فضائل میں ششماہی ''مجلّہ علوم اسلامیہ'' ہے جو اب بھی نکل رہا ہے شعبۂ اسلامیات سے۔ یہ ادارہ علوم اسلامیہ کا ترجمان ہے۔ اس مجلّہ کے وہ بانی ہیں۔

(۲) حضرت ڈاکٹر صاحب نے المجمع العلمی العربی الھندی کی تاسیس کی اور اس کے ترجمان کے طور پر ایک رسالہ مجلۃ المجمع العربی الھندی نکالا اس کے ۱۳ شمارے شائع کیے۔ ڈاکٹر اس کے بانی ہیں۔

یہ دونوں مجلّے اعلیٰ تحقیقی معیار پر اب بھی شائع ہوتے ہیں۔

☆ آبرو کے دو مخمس۔ معاصر پٹنہ، جنوری ۱۹۵۶ء
☆ کلام احمد علی رام پوری۔ معاصر پٹنہ، جون ۱۹۴۳ء
☆ کلام اقبال کے عربی تراجم۔ فکر و فن پٹنہ تحقیقات عربی و فارسی ۱۹۸۸ء
☆ خطوط اکبر۔ علی گڑھ میگزین ۱۹۵۱ء
☆ سید انشاء کی ایک نادر تصنیف مطر المرام فارسی
☆ غالب کا ایک معاصر۔ غالب نامہ نئی دہلی جنوری ۱۹۹۸ء
☆ میر حسن تجلی۔ غالب نامہ نئی دہلی جولائی ۱۹۵۷ء
☆ میر حسن علی تجلی کا دیوان۔ دلی کالج میگزین دہلی ۱۹۶۲ء میر نمبر
☆ تفتہ کی تضمین گلستاں۔ غالب نامہ جنوری ۱۹۹۰ء
☆ سال وفات جوش عظیم آبادی معاصر پٹنہ ۱۹۸۲ء
☆ حالی کی دو کمیاب تحریریں۔ غالب نامہ جولائی ۲۰۰۲ء
☆ انتخاب فارسی دیوان حاتم دہلوی۔ علی گڑھ میگزین مرتبہ سید امین اشرف
☆ دیوان حافظ اور تفاؤل۔ ایشیا میرٹھ شاعر نظامی ۱۹۲۹ء
☆ علی گڑھ میں تصانیف خسرو کے قلمی نسخے۔ بازیافت مجلّہ شعبۂ اردو اورینٹل کالج مارچ ۱۹۵۷ء
☆ اشعار ذوق۔ ہماری زبان علی گڑھ جون ۱۹۵۷ء
☆ راجا راج کشن راجا۔ غالب نامہ دہلی جنوری ۱۹۹۹ء
☆ تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ ادبی دنیا جون ۱۹۵۶ء

☆ قاضی سید رضا حسین عظیم آبادی۔ فکر و نظر، علی گڑھ
☆ دیوان رکن صاین ہروی۔ مجلہ علوم اسلامیہ دسمبر ۱۹۶۵ء
☆ مخمس رنگین۔ ہماری زبان علی گڑھ یکم اپریل ۱۹۵۷ء
☆ طہماس نامہ۔ غالب نامہ نئی دہلی ۱۹۸۸ء
☆ غالب در حدیث دیگراں مشولہ احوال غالب مرتبہ مختار الدین احمد
☆ کالی داس گپتا رضا۔ ہماری زبان ۲۸/ جون ۲۰۰۱ء
☆ غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں۔ غالب نامہ نئی دہلی جولائی ۱۹۹۲ء
☆ محمد احمد عثمانی ہماری زبان دہلی ۱۵/ نومبر ۱۹۹۴ء
☆ محمد طفیل کی یاد میں نقوش دسمبر ۱۹۸۷ء
☆ پروفیسر نجم الاسلام۔ ہماری زبان دہلی، ۷/ اپریل ۲۰۰۱ء
☆ یگانہ چنگیزی کے حالات۔ قومی زبان کراچی، مئی ۲۰۰۰ء
☆ ڈاکٹر سید محمد یوسف۔ خدا بخش لائبریری جرنل برہان دہلی ستمبر ۱۹۷۹ء
☆ ڈاکٹر ذکی الدین۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ دسمبر ۱۹۹۱ء
☆ رمز عظیم آبادی کی شاعری۔ مشمولہ مقالات بر رمز عظیم آبادی مرتبہ شمس الحق پٹنہ ۲۰۰۰ء
☆ مثنوی حیات و کائنات۔ ہماری زبان العلم کراچی ستمبر ۱۹۹۸ء
☆ ڈاکٹر خورشید احمد فارق۔ معارف اعظم گڑھ جنوری ۲۰۰۲ء
☆ قاضی عبدالودود۔ نقوش اکتوبر ۱۹۵۶ء
☆ قاضی عبدالودود کے خاندانی حالات۔ غالب نامہ، نئی دہلی جنوری ۱۹۹۷ء
☆ غالب اور قاضی عبدالودود۔ غالب نامہ ۱۹۹۳ء

حضرت ڈاکٹر مختار الدین احمد کے مقالات ۶۰۰ کے قریب ہیں۔ میں نے پچاس مقالات پیش کیے ہیں بطور نمونہ۔ البتہ ان کی عربی اور اردو کتابوں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ ان کی ڈی۔ لٹ کا تھیسس جو انہوں نے مشہور مستشرق گب کی نگرانی میں کیا تھا اس کے بارے میں کانفرنس گزٹ میں ایک تفصیلی مقالہ میں شائع کرا چکا ہوں مگر وہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب کی شہرت بحیثیت محقق عربی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں معروف ہے اور تینوں زبانوں میں ان کے وقیع کارنامے ہیں۔

ع ''ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما''

☆☆☆

# مالک رام کی دو نادر تحریریں

## کوٹلیہ کا ارتھ شاستر - اور - منو کی سمرتی

پیشکش: ڈاکٹر شائستہ خان

مالک رام صاحب پر ہم کچھ کام کر رہے تھے تو انکی کچھ نادر تحریریں مل گئیں ("زمانہ" بابت فروری ۱۹۳۵ء و اپریل ۱۹۳۴ء)۔ بہت خوشی ہوئی۔ عمر ستائیس اٹھائیس برس کی تھی! ابھی وہ رسالوں کی دنیا میں زیادہ معروف نہیں ہوئے تھے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ "زمانہ" کے ایڈیٹر یا کاتب نے انکے ایک مضمون پر تو انکا نام مالک رام لکھا اور دوسرے پر بالک رام۔ ڈگریاں بھی (ایم اے۔) جو دونوں جگہ ایک سی درج تھیں۔ اور قرائن بھی سو فی صدی اسی کے حق میں تھے کہ یہ بالک رام بھی مالک رام ہی ہیں۔

مالک رام صاحب غالبیات کے ماہر کی حیثیت سے تو مشہور ہیں ہی، اسلامیات پر بھی انکی گہری نظر رہی ہے۔ انکی معرکہ آرا تصنیف 'عورت اور اسلامی تعلیم' تو شایع ہوتے ہی دھوم مچا گئی تھی اور آج بھی اپنے موضوع پر حرف آخر سمجھی جاتی ہے۔ انھیں کے قلم سے ہندومت کی دو بنیادی کتابوں پر انکی یہ دو خاصی قدیم ترین کاوش قلم، امید ہے دلچسپی سے پڑھی جائیں گی۔

یہ تو ہوئی اس جہت کی دریافت کہ مالک رام صاحب اپنی تحریری زندگی کے آغاز میں بھی ہندومت اور اسلام، دونوں میں، برابر کی دلچسپی رکھتے تھے۔ ہندو ادبیات اور اسلامیات دونوں سے شغف کا نتیجہ جو نکلنا تھا وہ نکلا: کبیر اور گرو نانک کی طرح آج تک فیصلہ نہ ہو پایا کہ بقول ریاض صاحب (ریاض الرحمٰن شروانی): "کیا تھے مالک رام صاحب" ۔اسلامیات کی طرح ہندومت کی بنیادی کتابیں انکے مطالعہ میں آتی رہتی تھیں۔ بلکہ اس سے تو یہ بھی پتا چلتا ہے کہ انہوں نے بڑی گہرائی سے

اپنے دونوں موضوعات کا مطالعہ کیا تھا۔

اب جو اس خاص پیش کش کا مقصد ہے اس کی طرف آیئے تو ہمیں منو کی سمرتی اور کوٹلیہ عرف چانکیہ کے ارتھ شاستر کا بہت اچھا تعارف ایک ایسے ادیب شہیر کی زبانی مل جاتا ہے جس کا نام ان تحریروں پر دیکھ کر، بہت سے پڑھنے والے چونک اٹھیں گے۔ ہمیں بھی ایسی ہی حیرت ہوئی تھی پہلی بار یہ تحریریں دیا نرائن کے رسالہ 'زمانہ' میں دیکھ کر، مگر پھر پڑھکر بہت خوشی یوں ہوئی کہ مالک رام نے جس گہرائی سے اسلامی علوم کا مطالعہ کیا، وہی سچائی کی تلاش اور انتھک جستجو جو مالک رام کی پہچان بن گئی تھی، وہ ان دونوں مطالعات میں بھی موجود ہے۔

ان دو تحریروں کی دریافت سے مالک رام کے دو قدیم نوادر تو مل ہی جاتے ہیں، ساتھ ہی انکی اولیں دلچسپیاں بھی!

ایک گرہ اور بھی کھلتی ہے : اقبال کے بارے میں تو بجنوری کے ایک خوبصورت انگریزی مضمون کا ترجمہ بھی بڑے ذوق شوق سے کیا تھا؛ پھر آگے کیوں نہیں بڑھے۔ پھر اقبال کے مرشد (غالب) نے انھیں ایسا بے بس کیوں کر لیا تھا، یوں کہیں کہ اپنے بس میں کیوں کر لیا تھا کہ : اوڑھنا بچھونا بنالیا اسے! اور غالب تو پھر اوپر کی سطح تھی، جن کی وفات ہوئی تو مالک رام صاحب پیدا بھی نہیں ہوئے تھے؛ یہ ہمارے مالک رام صاحب تو وہاں تک پہنچے کہ مرشد (غالب) پر کوئی اچھا کام کرنے والا نکل آیا تو غالب کی طرح اس کے بھی پرستار ہو بیٹھے، ایسے کہ نذرِ عرشی کے نام سے غالب کے پرستار کو بھی شاندار خراجِ تحسین پیش کرنے میں لگ گئے۔ مالک رام صاحب کی نذروں کا جو وقیع سلسلہ نذرِ ذاکر سے لے کر نذرِ رحیمد تک چلا اس کا غالب سے نہیں غالب کے ایک محقق سے آغاز ہوا تھا۔ کہنا یہ تھا کہ اقبال سے ارادت کا جو آغاز ہوا تھا، وہ قدیم تر عظمت کی طرف کیسے مڑ گیا! عرشی صاحب کو چھوڑیے؛ لگتا ہے ذاکر صاحب کے لئے ان کے دل میں جو عزت و احترام پرورش پاتا رہا، اس کا بھر پور اظہار تو نذرِ ذاکر سے ہوا، لیکن رشتہ تو بڑا قدیم نکل آیا : وہ رشتہ جب ذاکر صاحب نے جرمنی کے قیام کے دوران دیوان غالب کا سب سے خوبصورت نسخہ شائع کیا تھا اور جسے اردو دنیا نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا!

گرہ کی طرف ہم نے اشارہ کیا : یہ غالب سے رشتہ مندی، نہ اس کے لئے عرشی صاحب بیچ میں آتے ہیں نہ ذاکر صاحب۔ یہ تو سیدھی سادی مسلک انسانیت کی راہ ہے جس پر سارے صوفی رواں دواں رہے؛ اور بالآخر غالب کا پرستار بھی اسی طرف چل پڑا :

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

کبیر اور نانک کا خاندان کبھی ویران نہیں رہا: نام بدلتے رہے؛ اور ہمارے عہد میں کم سے ایک نام ایسا ضرور سامنے آیا جو اسی خانوادے سے تعلق رکھتا تھا۔ چلیں ''عورت اور اسلامی تعلیم'' کے مصنف نے اسی زمانے کے آس پاس کوٹلیہ کا ارتھ شاستر اور منو کی سمرتی میں بھی سچ کو تلاش کرنے کی کیسی جاں سوزی کی تھی!

(ش)

سنہ ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے کہ ضلع تنجور کے ایک گانوں کا ایک برہمن ریاست میسور کے سرکاری مشرقی کتبخانہ میں آیا۔ اور مسٹر شام شاستری مہتمم کتب خانہ کو سنسکرت کے دو قلمی مسودے پیش کئے۔ مسٹر شاستری نے جب ان قلمی نسخوں پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ ایک کوٹلیہ کا ارتھ شاستر ہے جو مدت سے نایاب تھا اور دوسرا نسخہ اسی ارتھ شاستر کے ایک حصہ کی بھٹ سوامی نامی کسی شخص کی لکھی ہوئی شرح ہے۔

ارتھ شاستر کا سنسکرت کی علمی تاریخ میں جو مرتبہ ہے وہ مسٹر شام شاستری سے پوشیدہ نہ تھا۔ انھوں نے ۱۹۰۵ء میں اور اس کے بعد ولایت کے انگریزی رسالہ انڈین انٹی کوئری Indian Antiquary اور میسور ریویو میں اس کے بعض حصوں کا ترجمہ شائع کرایا۔ اس ترجمہ کا چھپنا تھا کہ علمی حلقوں میں ایک ہلچل مچ گئی۔ مستشرقین مغرب نے یکے بعد دیگرے اس کی اہمیت کا بڑے شاندار الفاظ میں اظہار کیا۔ ڈاکٹر جالی ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ۔ ڈاکٹر فلیٹ۔ ڈاکٹر ایف۔ ڈبلیو۔ طامس وغیرہ فاضلوں نے اسے ہندوستان کی قدیم تاریخ کا ایک بیش بہا ماخذ قرار دیا۔ اور تاریخ ہند سے دلچسپی رکھنے والوں نے ان مختصر و نامکمل مضامین کو سر آنکھوں پر لیا اور مترجم کی حوصلہ افزائی کی۔ کتاب کی اہمیت اور پبلک کی مانگ کو مد نظر رکھتے ہوئے مسٹر شام شاستری نے ۱۹۰۹ء میں اصل سنسکرت مسودہ مرتب کر کے شائع کر دیا اور اس کے پانچ برس بعد ۱۹۱۳ء میں اس کا انگریزی ترجمہ بھی پہلی بار چھاپ دیا۔ اصل کتاب دو دفعہ اور ترجمہ تین

چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں کتاب کے تمام الفاظ کا ایک انڈکس (ورد اشاریہ) بھی چھاپ دیا۔

اس وقت تک سنسکرت اور پالی کی جس قدر کتابیں شائع ہو چکی ہیں وہ ہندوؤں کی دماغی اور روحانی ترقی کی ناقابلِ تردید شہادت ہے۔ مگر ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں جو دنیاوی اور عملی میدان میں ہندوؤں کی نمایاں کامیابی کی دلیل سمجھی جائیگی۔ مگر ارتھ شاستر نے یہ گم شدہ کڑی مہیا کر دی ہے۔ اس نے دنیا پر روشن کر دیا ہے کہ اگر ہندو مذہب و اخلاقیات، فلسفہ و روحانیات میں اقوامِ دنیا کے پیشرو ہیں تو عملی دنیا میں بھی وہ کسی سے کم نہیں۔

اس کتاب کے پندرہ حصے اور ڈیڑھ سو ابواب ہیں جن کا مجموعی حجم سوا چار سو (۴۲۵) صفحات ہے۔ اور قانون۔ سیاست و معاشرت کا کوئی شعبہ نہیں جس کے متعلق اس کتاب میں مفصل احکام نہ ہوں اس کے ہر باب کے آخر میں کوٹلیہ کا نام درج ہے اور پوری کتاب کے اختتام پر لکھا ہے:۔

"یہ شاستر اس نے لکھا ہے جس نے احکامِ مذہبی، علمِ حرب اور دنیا کو جو نند خاندان کے بادشاہ کے تحت تھے بدنظمی سے بچا لیا۔ یہ کتاب کے پہلے باب سے ایکسو پچاسواں باب ہے۔ یوں کوٹلیہ کے ارتھ شاستر کا پندرھواں حصہ ختم ہوا۔ شاستروں کی شرحیں لکھنے والوں کی غلطیاں دیکھکر وشنوگپت نے خود یہ اسوترا اور شرح لکھی ہے۔"

ان سطور میں مصنف نے اپنے دو نام کوٹلیا اور وشنوگپت دیے ہیں۔ روایت اسے ایک تیسرے نام چانکیہ سے بھی موسوم کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وشنوگپت اس کا اصلی نام ہے کوٹلیہ (ٹیڑھا۔ بوجہ اپنی حکمتِ عملی کے) لقب اور چانکیہ (چنک کا بیٹا) کنیت ہے۔

چانکیہ نے مگدھ کے نند خاندان کے استیصال اور موریا خاندان کے برسرِ اقتدار آنے میں جو کام کیا وہ تاریخ کے طالب علم سے مخفی نہیں۔ چندرگپت کے تخت نشین ہونے کے بعد وہ مدتوں اس کا وزیر رہا۔ اور اگر روایت پر اعتبار کیا جائے تو حکومت کے استحکام کے بعد عنانِ وزارت نند خاندان کے وزیر راکشش کے سپرد کر کے آپ گوشہ نشین ہو گیا۔[۱]

بعض حلقوں میں کتاب کی قدامت اور مصنف کی تاریخی ہستی سے انکار کیا گیا ہے۔ اسلئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام دلائل کو یکجا کر دیا جائے جن سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ارتھ شاستر واقعی چندرگپت موریا کے وزیر چانکیہ کی تصنیف ہے۔ اس کا زمانہ ۳۲۰ قبل مسیح سے لے کر

---

[۱] مدرا راکشس ناٹک (وساکھ دت)

۲۹۵ سنہ ق۔م تک ہے۔

جیسا کہ ارتھ شاستر کی مندرجہ بالا نقل شدہ عبارت سے ظاہر ہے چانکیہ نے نند خاندان کی معزولی میں نمایاں حصہ لیا۔ اگر اس کی ریشہ دوانیاں، حکمت عملی اور عقل پختہ کار چندر گپت کی پشت پناہ نہ ہوتی تو چندر گپت کا شاہی خاندان کے ایک خاص رکن اور رعایا میں بیحد ہر دلعزیز ہونے کے باوجود بھی، مہاراجہ مہاپدم آخری بادشاہ نند خاندان کے مقابلہ میں کامیاب ہونا محال ہوتا۔ چندر گپت اور چانکیہ کے مابین اس سیاسی تعاون کا ثبوت وشنو پران کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ملتا ہے:۔

پہلے مہاپدم: پھر اس کے بیٹے صرف نو کی تعداد میں سو سال کے لئے دنیا کے حکمران ہو گئے۔ ان نندوں کو ایک برہمن کوٹلیہ قتل کریگا۔ ان کی موت پر موریا (خاندان کے بادشاہ) دنیا (کی بادشاہت) کا لطف اٹھائیں گے۔ کوٹلیہ خود چندر گپت کو تخت نشین کریگا، اس کا بیٹا بندوسار ہوگا اور اس کا بیٹا اشوک وردھن[1]

چندر گپت کی تخت نشینی کے لئے بھاگوت پران۔ ستیسیہ۔ وایو اور برہمانڈ پران بھی کوٹلیہ کو ہی ذمہ دار سمجھتے ہیں۔

چندر گپت اپنے آخری ایام میں جین مت کا مقلد ہو گیا تھا، اور چونکہ جین مت میں ایسی موت جو فاقہ کشی (برت) سے ہو بہت بڑے ثواب کی موت سمجھی جاتی ہے، اس لئے روایت ہے کہ چندر گپت دکن میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر جاکر عزلت گزین ہو گیا تھا، وہاں ریاضت اور فاقہ کشی سے اس کی موت واقع ہوئی۔ ریاست میسور میں ایک پہاڑی چندر گری ہے، ممکن ہے وہ اس عظیم الشان انسان کی آخری آرام گاہ ہو۔ بہر حال اس واقعہ سے چندر گپت کو جینیوں کے مذہبی حلقوں میں بہت وقعت حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ جین مت کے اولیا کی فہرست میں اس کا نام بھی شامل کر لیا گیا ہے ہیم چندر نے اپنی کتاب "ستھاویراولی چرت" (جینی ولیوں کے سوانح حیات) میں جہاں چندر گپت کا حال درج کیا ہے وہاں چانکیہ کا نام بھی چندر گپت کے حلیف اور نند خاندان کے اقتدار کو تباہ کرنے والے حلیف ... ... ... ... ... ... ... کی حیثیت سے درج ہے۔ اسی طرح نند سوتر جو پراکرت زبان میں جینیوں کی مشہور مذہبی کتاب ہے درج ہے کہ چانکیہ کو چندر گپت کے وزیر مالیات کی حیثیت سے بڑی کامیابی ہوئی۔ جینیوں کے "رشی منڈل پرکرن ورتی" میں بھی ان دونوں کے دوستانہ

---

[1] وشنو پران ۴: ۲۴

تعلقات کا ذکر ہے۔ اِن کے علاوہ بودھوں کی کتابوں میں چانکیہ کی سیاسی خدمات کا بڑے شاندار الفاظ میں تذکرہ ہے:۔

کامندک نہایت زوردار الفاظ میں اسی واقعہ کا یوں ذکر کرتا ہے[1]:۔

"سلام پہونچے زیرک و فاضل وشنو گپت پر جو اس مشہور اور عظیم الشان خاندان کا نام لیوا تھا جس کے افراد نے رشیوں کی سی زندگی بسر کی۔ سلام پہونچے اس پر جس کی توانائی کی آگ برق خاطف کے مانند تھی اور جس کی غیر معمولی طاقتوں نے جو اپنی تاثیر اور تیزی کے لحاظ سے بادل کی کڑک کی مثال تھیں، نند خاندان کی وسیع، مشہور، طاقتور اور باجبروت سلطنت کو ہمیشہ کے لئے بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا جس نے تنہا اپنی دانائی اور سرگرمی سے تمام دنیا کو چندر گپت (موریا) کے قدموں پر لا ڈالا، جو بہترین حکمران تھا سلام پہونچے اُس دانا ترین بشر پر جس نے ارتھ شاستر کے ساگر سے نیتی کا امرت نکالا۔"

درحقیقت نیتی سار ارتھ شاستر کے بعض حصوں کو چھوڑ کر باقی کا خلاصہ ہے۔ ڈنڈی نے اپنی دش کمار چرتر میں بھی ارتھ شاستر اور کوٹلیہ کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتا ہے[2]

"ڈنڈ نیتی کا گیان (علم سیاست) آچاریہ وشنو گپت نے موریا بادشاہوں کی رہنمائی کے لئے چھ ہزار اشلوکوں میں لکھا ہے۔"

اس بیان کی صداقت خود ارتھ شاستر سے عیاں ہے۔ کوٹلیہ لکھتا ہے[3]:۔

تمام علوم کے مطالعہ اور متداول اسلوب بیان پر غور کرنے کے بعد کوٹلیہ نے قانون کے متعلق یہ اصول و قواعد بادشاہوں کے فائدے کے لئے لکھے ہیں:

پھر لکھتا ہے[4]:۔

"اس کتاب میں سب کچھ ہے، تمام کتاب میں پندرہ حصے، ڈیڑھ صد ابواب، ایک سو اسی سیکشن اور چھ ہزار اشلوک ہیں"۔

اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، اول یہ کہ ارتھ شاستر واقعی کوٹلیہ کی تصنیف ہے، دوسرے یہ کہ موجودہ کتاب ہی وہ اصل کتاب ہے جو کوٹلیہ نے لکھی تھی اور اس میں تحریف کا کوئی شبہ نہیں، کیونکہ موجودہ صورت میں بھی کتاب تقریباً چھ ہزار اشلوکوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ڈنڈی نے جو اقتباس ارتھ شاستر سے دیئے ہیں وہ موجودہ کتاب میں من و عن موجود ہیں۔

پنچ تنتر کے مقدمہ میں ہے:۔

---

[1] نیتی سار (۱: ۴-۶)، [2] دش کمار چرتر (۲: ۸)، [3] ارتھ شاستر (۲: ۱۰) [4] ارتھ شاستر (۱: ۱)

• دھرم شاستر منو اور دوسرے مصنفوں کے: ارتھ شاستر چانکیہ اور دوسروں کے اور کام سوتر و تسائن اور دوسروں کے ہیں"

گویا پنچ تنتر کے مصنف کے نزدیک بھی ارتھ شاستر کوٹلیہ کی تصنیف ہے۔

بعض اور اُمور جو ارتھ شاستر کے زمانۂ تصنیف پر دلالت کرتے ہیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) اشوک وردھن (۲۷۳ - ۲۳۲ قبل مسیح) کے کتبوں میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن کا اس وقت تک ٹھیک طور پر سمجھنا مشکل ہے، جب تک ارتھ شاستر کی مدد نہ لی جائے۔ یہ الفاظ اِن کتبوں میں بھی پہلی بار ہی استعمال ہوئے ہیں اور بعد کے مصنفین نے بھی انھیں اپنی کتابوں میں استعمال نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اشوک نے یہ الفاظ ارتھ شاستر سے مستعار لئے۔ پس ارتھ شاستر ان کتبوں سے پہلے کی تصنیف ہے۔

(۲) پانِنی نے سنسکرت صرف و نحو پر مشہور زمانہ کتاب اشٹا دھیائی لکھی ہے وہ اس فن کی مسلّمہ طور پر بہترین کتاب ہے۔ اس کی تصنیف کے بعد کسی مصنف کو ان قواعد کی خلاف ورزی کی جو اس میں درج ہیں جرأت نہیں ہوئی۔ ارتھ شاستر میں پانِنی کے اصولوں کے خلاف ایک نہیں دو نہیں بیسیوں مثالیں درج ہیں، جس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ پانِنی سے ماقبل کے زمانہ کا ہے کیونکہ یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ کوٹلیہ جیسا فاضل شخص مسلّمہ قواعد صرف و نحو کے خلاف کچھ لکھ کر اپنی تضحیک کا سامان مہیا کرتا۔

(۳) ارتھ شاستر میں جس سوسائٹی کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے، کہ بدھ مت اپنے عروج پر نہیں پہونچا تھا، جہاں چندر گپت کے پوتے اشوک وردھن کی سرپرستی نے اسے پہونچا دیا یا گوتم کلیہ اور منو میں اس بات کا صاف ثبوت ملتا ہے کہ بدھ مت نے بہت نمایاں حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ارتھ شاستر اشوک سے پہلے کی تصنیف ہے۔

مگر ان سب سے بڑھ کر حسنِ اتفاق سے ایک اور زبردست شہادت بھی ایسے شخص کی جو ارتھ شاستر کے مصنف کا ہم عصر تھا ہم تک پہونچ گئی ہے۔

جب اسکندرِ اعظم کی ہندوستانی یلغار سے واپسی پر کثرتِ شراب کے باعث بابل میں قبل از وقت موت واقع ہوئی، تو اس کی عظیم الشان سلطنت کے حصے بخرے ہوگئے اور مشرقی حصہ کا مالک اسکندر کا جرنیل سیلوکس نقاطور بن گیا۔ یہ بڑا اولو العزم شخص تھا اور اسکندر کے ہندوستانی حملہ میں اس کے ہمراہ آیا تھا۔ اس نے ۳۰۵ ق م میں فیصلہ کیا کہ اسکندر کے ماتھے پر جو ناکامی کا داغ ہے اسے مٹائے۔

چنانچہ اس نے اسی سال ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ مگر اب حالات بدل چکے تھے۔ وہ اسکندر کے وقت کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور کمزور راجہ غائب ہو گئے تھے اور اُن کی جگہ ایک زبردست سلطنت اور جابر حکمران سیلوکس کا مقابلہ کرنے کو موجود تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیلوکس کو شکست ہوئی اور تاوان جنگ کے طور پر اپنی سلطنت کے تین مشرقی اضلاع (کابل۔ قندھار۔ ہرات ؟) چندر گپت کے حوالے کرنے پڑے اور اپنی دختر بلند اختر بھی ہندوستانی فاتح کے حبالۂ عقد میں دینا پڑی اور آئندہ کے لئے سیلوکس نے اپنا سفیر چندر گپت کے دربار پاٹلی پتر میں رہنے کے لئے بھیجا سب سے پہلا سفیر میگاستھنز میجسطنی (Megasthenes) تھا اس نے اپنے قیام ہندوستان کے دوران میں ایک کتاب لکھی جس میں اپنے چشم دید اور لوگوں سے سُنے ہوئے واقعات درج ہیں، بدقسمتی سے یہ کتاب ہم تک نہیں پہونچی۔ مگر بعد کے مصنفین نے اپنی تصانیف میں اس کے اقتباسات دیئے ہیں، یہ اجزا جمع کر کے چھاپ دیئے گئے ہیں ظاہر ہے کہ ان منتشر حوالوں سے ہم پوری کتاب کا اندازہ نہیں لگا سکتے تاہم ان سے اُس وقت کی سوسائٹی، معاشرت اور نظام حکومت کے متعلق جو کچھ پتہ چلتا ہے وہ ہمارے لئے نہایت بیش بہا ہے ڈاکٹر اسمتھ نے اپنی تاریخ ہندوستان قدیم (Early History of India) میں ارتھ شاستر اور میگاستھنز کے ان اجزا کا مقابلہ کر کے ثابت کیا ہے کہ دونوں ایک ہی معاشرت اور حکومت کا ذکر کر رہے ہیں۔ مثلاً جزو ۳۴ کو لیجئے۔

میگاستھنز لکھتا ہے :۔

"۱۔ حکومت کے بڑے افسروں میں سے بعض بازار کے مہتمم ہیں۔ بعض شہر کے اور بعض سپاہ کے"

یہ ارتھ شاستر کے سنی دھاتا (جس کے ماتحت کئی ملازم تھے جو تجارتی معاملات کے ذمہ دار تھے) اور ناگرک یعنی داروغہ شہر (جو میونسپل انتظامات اور شہر کی حفاظت کا نگراں تھا) اور سیناپتی (فوج کے افسر اعلیٰ) کے مترادف ہیں۔"

"۲۔ بعض افسر دریاؤں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ بعض زمین کی پیمائش اور راجباہوں کی نگرانی کرتے ہیں، جن کے ذریعہ پانی بڑی نہروں سے تقسیم کیا جاتا ہے۔"

کوٹلیہ دریاؤں اور بحری راستوں کی حفاظت پر بھی مفصل بحث کرتا ہے، یہ شعبے امیرالبحر کے ماتحت تھے، مالگذاری کے ذرائع میں نہروں کا ذکر ہے۔[۱] زمین کی پیمائش اور متعلقہ پیمانوں پر احکام درج ہیں۔[۲]

---

[۱] ارتھ شاستر (۳: ۱۰، [۲] ارتھ شاستر (۲: ۳۵)

۳۔ "یہی لوگ شکاریوں کی نگرانی کے ذمہ دار ہیں۔۔۔۔"
ارتھ شاستر میں شکاریوں کی نگرانی چراگاہوں کے افسر اعلیٰ کے سپرد کی گئی ہے۔[1]
۴۔ "وہ محصول وصول کرتے، پیشہ وروں کی نگہداشت کرتے اور سڑکیں بنواتے ہیں۔۔۔ وغیرہ وغیرہ"
ارتھ شاستر میں مختلف طرح کے محصولات اور لگان وغیرہ وصول کرنے پر بھی نہایت تفصیلی احکام درج ہیں۔[2]

میگاستھینز نے جو ذکر محکمہ جنگ اور اس کے مختلف شعبوں کا کیا ہے وہ بعینہ وہی ہے جو ارتھ شاستر میں درج ہے، بہرحال جو کچھ میگاستھینز نے حکومت اور معاشرت کے متعلق لکھا ہے اس کا مثنیٰ ارتھ شاستر میں بھی موجود ہے۔

ان صفحات میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس سے ناظرین پر یہ بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ:-
(۱) کوٹلیہ اور چندر گپت موریا کے درمیان سیاسی رشتہ تھا اور موخر الذکر کی کامیابی میں کوٹلیہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔
(۲) کوٹلیہ نے ایک کتاب ارتھ شاستر علم سیاست کے اصولوں پر تصنیف کی تھی، اور
(۳) وہ ارتھ شاستر یہی کتاب ہے جو ہمارے پاس موجود ہے، یہ بالکل وہی ہے جیسی کوٹلیہ نے لکھی تھی اور اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہوا۔

آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آج سے اڑھائی ہزار برس پہلے ایسی کتاب کا لکھا جانا ہمارے ملک کے لئے کس قدر باعث فخر و مباہات تھا۔ اس مقام پر پہونچنے کے لئے کتنا طویل زمانہ درکار ہوا ہوگا۔

(باقی آئندہ)

[1] ارتھ شاستر (۲: ۲۳)　[2] ارتھ شاستر (۲: ۶)

# اسلام اور Pluralism کے متعلق

## مولانا ابوالکلام آزاد کے نظریات کا جائزہ

ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی

حضورﷺ نے تکثیری معاشرہ کی بنیاد کا آغاز قبل از اسلام معاہدہ ''حلف الفضول'' (۳۷ قبل ہجری ۵۸۶ء) میں کیا تھا اس تاریخی معاہدوں کی مرکزی دفعہ یہ تھی کہ کوئی عرب غلام کے مقابلہ میں ظالم کی حمایت نہیں کرے گا۔اس تاریخ ساز معاہدہ کو تکثیری معاشرہ کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ کسی بھی سماج یا معاشرہ کے بقاؤ تحفظ کیلئے جن عناصر کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس میں کما حقہ موجود ہیں۔اس میں قیام امن،عدل و مساوات،اخوت و بھائی چارگی،ایثار و فاداری،بنیادی انسانی حقوق،مظلوموں کی دادرسی جیسے بنیادی دفعات شامل ہیں۔

محسن انسانیت محمدﷺ کی نگاہ قدر شناس میں اس معاہدہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا: اس معاہدے کے مقابلہ میں اگر مجھے سرخ اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں نہ بدلتا اور آج بھی اس معاہدہ کیلئے کوئی بلائے تو میں شرکت کیلئے تیار ہوں۔(ابن کثیر الجزری/ الکامل فی التاریخ،۲/۴۱،دار صادر بیروت)۔

حضورﷺ کی مساعیٔ جمیلہ کی بدولت،بنو ہاشم،بنو عبدالمطلب،بنو اسد بن عبدالعزی،بنو زہرہ،بنو کلاب اور بنو تمیم بن مرہ عبداللہ بن جدعان کے گھر جو اپنی قوم کے سردار تھے جمع ہوئے اور معاہدۂ ''حلف الفضول'' طے پایا۔اس سیاسی معاہدہ حلف الفضول کی اہم دفعات درج ذیل تھیں:

۱- مکے سے بدامنی دور کی جائے گی۔

۲- مسافروں کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے گا۔

۳- مظلوموں کی امداد کی جائے گی خواہ وہ مکے کے باشندے ہوں یا اجنبی۔

۴- زبردست کو زیردست پر ظلم و زیادتی سے روکا جائے گا۔(ابن سعد الطبقات الکبریٰ ۱/ ۱۲۸)

رسول اکرمﷺ اس انجمن امن کے رکن اعلیٰ تھے اس کی بدولت عرب کے تکثیری سماج میں بڑی حد تک

قبول فرمایا کر انہیں بطور شہری قبول فرمایا یہ سب وہ لوگ تھے جنہوں نے حضور ﷺ کی دعوت اسلام کو قبول نہیں کیا تھا بلکہ اپنے سابقہ مذاہب پر قائم رہتے ہوئے ریاست مدینہ میں کے ماتحت ہوگئے تھے۔ حضور ﷺ نے ان کے تحفظ کی خاطر مثبت اقدامات فرمائے۔

ہمارے سماج میں مختلف اور متنوع گروہ موجود ہیں۔ انسانی سماج میں یہ تنوع رنگ، نسل، علاقے زبان کا بھی ہے، لباس، طرزِ بود و باش اور ثقافتی مظاہر کا بھی ہے اور عقائد، نظریات اور فلسفہ حیات کا بھی۔ انسانوں کے درمیان عقیدے اور دین کے فرق کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید بتاتا ہے کہ اس فرق کی وجہ وہ آزادی ہے جو اللہ نے انسانوں کو دی ہے۔ یہ آزادی اللہ کی مشیت کی بنا پر ہے۔ اُس نے انسانوں کو جبراً کسی ایک راستے کے اختیار کرنے کا پابند نہیں کیا ہے:

اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد کہ انسانی سماج میں تنوع اور اختلاف عملاً موجود ہے، غور فرمائیے کہ سورہ حجرات میں اللہ تعالیٰ نے قبیلوں اور برادریوں کے فرق کی حکمت یہ بتائی ہے کہ انسان ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ اس فرق کی بنیاد پر کسی تعصب کی گنجائش نہیں ہے۔

گویا انسانی گروہ جب ایک دوسرے کی منفرد و مخصوص صلاحیتوں کو ''پہچان'' لیتے ہیں تو اُن کے لیے باہمی تعاون کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ کوئی قبیلہ تجارت کی خاص صلاحیت رکھتا ہے، کوئی کھیتی باڑی میں آگے ہوتا ہے، کسی کے افراد صنعت و حرفت میں پیش قدمی کر کے اپنی مخصوص مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کسی قبیلے کے لوگ زیادہ فصیح اور زبان پر قدرت رکھنے والے ہوتے ہیں۔ جب انسانی نسلوں اور قوموں کی ان متنوع صلاحیتوں کو پہچان لیا جاتا ہے تو انسانی گروہوں کے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے کی اور باہمی تعاون کرنے کی راہ ہموار ہوجاتی ہے۔

مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ ظہور قرآن کے وقت پانچ دینی تصور پائے جاتے تھے۔ چینی، ہندوستانی، مجوسی، یہودی اور مسیحی۔ چین میں قدیم زمانے سے مقامی خداؤں کے ساتھ ایک آسمانی ہستی کا اعتقاد بھی موجود تھا۔ ایک ایسی بلند اور عظیم ہستی جس کی علویت کے تصور کے لئے ہم آسمان کے سوا اور کسی طرف نظر نہیں اٹھا سکتے۔ آسمان حسن و بخشائش کا بھی مظہر ہے اور قہر و غضب کی بھی ہولنا کی، اس لئے آسمانی خدا کے تصور میں بھی دونوں صفتیں نمودار ہوئیں، ایک طرف اس کی وجود بخشائش ہے۔ دوسری طرف اس کا قہر و غضب ہے۔ (ترجمان القرآن ج ص۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹)۔

ہندوستان کے تصور الوہیت کی تاریخ متضاد تصوروں کا ایک حیرت انگیز منظر ہے۔ ایک طرف اس کا توحیدی فلسفہ ہے، دوسری طرف اس کا عملی مذہب ہے۔ توحیدی فلسفہ نے استغراق فکر و عمل کے نہایت گہرے اور دقیق مرحلے طے کئے اور معاملہ کو فکر کی بلندیوں کی ایک ایسی اونچی سطح تک پہنچا دیا۔ جس کی کوئی دوسری مثال

ہمیں قدیم قوموں کے مذہبی تصورات میں نہیں ملتی۔ عملی مذہب نے اشتراک اور تعدد الٰہ کی بے روک راہ اختیار کی اور اضافی تصوروں کو اتنی دور تک پھیلنے دیا کہ ہر پتھر معبود ہو گیا۔ ہر درخت خدائی کرنے لگا اور ہر چوکھٹ سجدہ گاہ بن گئی وہ بہ یک وقت زیادہ سے زیادہ پستی میں بھی گرا اس کے خواص نے اپنے لئے توحید کی راہ اختیار کی اور عوام کیلئے اشراک اور اصنام پرستی کی راہ مناسب سمجھی (ایضاً ص:۲۶۲۔۲۶۷)۔

مولانا آزاد وحدانیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ وحدانیت کے فلسفہ نے بڑی وسعتیں اور گہرائیاں پیدا کیں ،لیکن خواص کے توحیدی تصور میں عوام کے اشراکی تصور سے مفاہمت کا جو میدان پیدا ہو گیا تھا وہ متزلزل نہ ہوسکا، بلکہ اور زیادہ مضبوط اور وسیع ہوتا گیا۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ انسانی جمعیت کا یہ حال تھا کہ لوگ قدرتی زندگی بسر کرتے تھے اور ان میں نہ تو کسی طرح کا باہمی اختلاف تھا نہ کسی طرح کی مخاصمت ،سب کی زندگی ایک ہی طرح کی تھی، پھر ایسا ہوا کہ نسل انسانی کی کثرت اور ضروریات معیشت کی وسعت سے طرح طرح کے اختلافات پیدا ہو گئے اور اختلاف نے تفرقہ وظلم وفساد کی صورت اختیار کر لی۔ ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرنے لگا، باہم ایک دوسرے کے حقوق پامال ہونے لگے۔اس لئے نسل انسانی کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کی ہدایت ،سماج اور معاشرہ میں عدل ومساوات، اخوت ومحبت کا پیغام عام کیا جائے (ایضاً ص:۳۵۲)۔

قرآن کریم میں مذکور ہے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ۔ (سورہ یونس:۱۹)۔

''اور ابتداء میں تمام انسانوں کا ایک ہی گروہ تھا۔ (الگ الگ گروہوں میں متفرق نہ تھے) پھر ایسا ہوا کہ وہ باہم دیگر مختلف ہو گئے اور اگر اس بارے میں تمہارا پروردگار نے پہلے ایک فیصلہ کر دیا ہوتا (یعنی یہ کہ انسانوں میں اختلاف ہوگا اور مختلف راہیں لوگ اختیار کریں گے) تو جن باتوں میں لوگ باتوں میں لوگ اختلاف کرتے ہیں ان کا (یہیں دنیا میں) فیصلہ کر دیا جاتا''۔

مولانا آزاد تکثیر سماج کے متعلق رقمطراز ہیں کہ دنیا میں کوئی بانیٔ مذہب بھی ایسا نہیں ہوا جس نے ایک دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ واختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو، سب کی تعلیم یہی تھی کہ خدا کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کیلئے ہے، الگ الگ کر دینے کیلئے نہیں ہے پس ایک پروردگار کی بندگی میں سب متحد ہو جائیں، اور تفرقہ ومخاصمت کی جگہ باہمی محبت ویکجہتی کی راہ اختیار کریں (ایضاً ص:۳۶۰)

سورہ مائدہ آیت نمبر ۴۸ کی تفسیر میں مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں: ''اگر خدا چاہتا تو تمام نوع انسانی

کو ایک ہی قوم و جماعت بنا دیتا اور فکر و عمل کا کوئی اختلاف وجود ہی میں نہ آتا، لیکن معلوم ہے کہ خدا نے ایسا نہیں چاہا، اس کی حکمت کا مقتضی یہی ہوا ہو کہ فکر و عمل کی مختلف حالتیں پیدا ہوں، پس اس اختلاف کو حق و باطل کا اختلاف کیوں بنا لیا جائے کیوں اس اختلاف کی بنیاد پر ایک جماعت دوسری جماعت سے برسرپیکار رہے اصل چیز جس پر تمام تر توجہ مبذول کرنی چاہئے ''خیرات'' ہے یعنی نیکی کے کام ہیں اور تمام اعمال و رسوم بھی انہیں کیلئے ہیں (ایضاً، ص:۳۷۴) مولانا آزاد نے یہ بھی لکھا ہے ''دین''، ''شرع'' اور ''منہاج'' دونوں الگ الگ ہیں۔ دین اصل ہے اور وہ خدا پرستی اور نیک عملی کا قانون ہے۔ ''شرع'' اور ''منہاج'' دستور العمل اور طور طریقہ ہے جو اس اصل کے مطابق زندگی بسر کرنے کیلئے ٹھہرایا جاتا ہے دین ایک ہی اور سب نے اس کی تعلیم دی لیکن ''شرع'' اور ''منہاج'' میں اختلاف ہوا، کیونکہ ہر عہد اور ہر ملک کے احوال وظروف یکساں نہ تھے، اسلئے ''شرح اور منہاج'' بھی یکساں نہیں ہو سکتی تھی۔ پیروان مذہب کی گمراہی یہ ہے کہ انہوں نے دین کی وحدت بھلا دی ہے اور محض شرع و منہاج کے اختلاف پر گروہ بندیاں کر کے ایک دوسرے کو جھٹلاتے رہے ہیں''۔ (ترجمان القرآن، ج:۲، ص:۶۳۴)

مولانا نے لکھا ہے کہ شریعتوں کے اس اختلاف ہی کے لئے نہیں، بلکہ فکر و عمل کے ہر اختلاف کیلئے رواداری اور وسعت نظری کی تعلیم قرآن میں ملتی ہے، حتی کہ جو لوگ اس کی دعوت کے خلاف جبر و تشدد کام میں لا رہے ہیں ان کی طرف سے بھی اسے معذرت کرنے میں تامل نہیں ایک موقع پر خود پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے: تم جوش دعوت میں چاہتے ہو کہ ہر انسان کو راہ حقیقت دکھا دو، لیکن تمہیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ اختلاف فکر و عمل طبیعت انسان کا قدرتی خاصہ ہے تم یہ چیز کسی کے اندر ایک ساتھ نہیں اتار سکتے۔ (ترجمان القرآن، ج:۱، ص:۳۷۶)

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (سورہ انعام، آیت نمبر:۱۰۸)

''اور جو لوگ خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں تم ان پر سب و شتم نہ کرو کیونکہ نتیجہ یہ نکلے کہ یہ لوگ بھی از راہ جہل و نادانی خدا کو برا بھلا کہنے لگیں گے۔ یاد رکھو ہم نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر گروہ کو اپنا ہی عمل اچھا دکھائی دیتا ہے پھر بالآخر سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے اور وہیں ہر گروہ پر اس کے اعمال کی حقیقت کھلنے والی ہے''۔

مولانا نے لکھا ہے کہ ہر انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوتی ہے کہ ہر جماعت کو اپنا ہی طریقہ اچھا دکھائی دیتا ہے وہ اپنی باتوں کو دوسروں کی مخالفانہ نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا، جس طرح تمہاری نظر میں سب سے بہتر راہ

تمہاری ہے ٹھیک اسی طرح دوسروں کی نظر میں سب سے بہتر راہ ان کی ہے، پس اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس بارے میں تحمل اور رواداری کو اپنے اندر پیدا کرو۔ (ایضاً، ص: ۳۷۷)۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّهِ أَن يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَى فِي خَرَابِهَا أُوْلَـئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَن يَدْخُلُوهَا إِلاَّ خَآئِفِينَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ (سورہ بقرہ آیت نمبر: ۱۱۴)۔

یعنی مذہبی گروہ بندوں کی گمراہی کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی عبادت گاہیں تک الگ الگ ہوگئیں ہیں اور باوجودیکہ تمام پیروان مذہب ایک ہی خدا کے نام لیوا ہیں ممکن نہیں ایک مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کی بنائی عبادت گاہ میں جا کر خدا کا نام لے سکے۔ (ایضاً، ص: ۳۸۸)

تکثیری معاشرہ میں رواداری:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُولُواْ اشْهَدُواْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ" (سورہ آل عمران، آیت نمبر: ۶۴)

مولانا آزاد نے آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ اگر تمہاری مخالفت محض تعصب ونفسانیت کی وجہ سے نہیں ہے اور دین وحق پرستی کی کچھ بھی طلب باقی ہے تو آؤ اختلافی نزاع کی ساری باتیں چھوڑ دیں اور توحید پرستی کی ان بنیادی صداقتوں پر متفق ہو جائیں جو خود تمہارے یہاں بھی مسلم ہیں، اگرچہ عملاً فراموش کردی گئی ہیں، کہ:

الف۔ خدا کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔

ب۔ جو کچھ ہے اس کے لئے ہے اس میں کسی دوسری شئے کو شریک نہ کیا جائے۔

ج۔ کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنے لئے ایسا مقدس اور معصوم نہ بنالے گویا اسے خدا بنا دیا ہے۔

(ترجمان القرآن، ج: دوم، ص: ۳۱۳)

مولانا نے رواداری کے متعلق لکھا ہے کہ رواداری یقیناً ایک خوبی کی بات ہے لیکن ساتھ ہی عقیدے کی مضبوطی، رائے کی پختگی اور فکر کی استقامت کی خوبیوں سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ پس یہاں کوئی نہ کوئی حد بندی کا خط ضرور ہونا چاہئے جو ان تمام خوبیوں کو اپنی جگہ قائم رکھے۔ عفو ودرگزر بڑی حسن وخوبی کی بات ہے لیکن یہی عفو ودرگزر جب اپنی حد سے آگے بڑھ جاتا ہے، تو عفو ودرگزر نہیں رہتا، اسے بزدلی اور بے ہمتی کے نام سے پکارنے لگتے ہیں شجاعت انسانی سیرت کا سب سے بڑا وصف ہے، لیکن یہی وصف جب اپنی حد سے

گزر جائے گا تو نہ صرف اس کا حکم ہی بدل جائے بلکہ اس کی صورت ہی بدلی جائے گی۔

البتہ رواداری یہ ہے کہ اپنے حق واعتقاد وعمل کے ساتھ دوسرے کے حق اعتقاد کا بھی اعتراف کیجئے اوراگر دوسرے کی راہ آپ کو صریح غلط دکھائی دے رہی ہے جب اس کے حق سے انکار نہ کیجئے کہ وہ اپنی غلط راہ پر بھی چل سکتا ہے اگر رواداری کے حدود یہاں تک بڑھا دیئے گئے کہ وہ آپ کے عقیدوں میں بھی مداخلت کرنے لگے اورآپ کے فیصلوں کے بھی آڑے آجائے تو پھر یہ رواداری نہ ہوئی، استقامت فکر کی نفی ہوئی۔

مفاہمت زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے لیکن یہاں بھی حد بند کی کوئی لکیر کھینچنی پڑے گی۔اور جس حد پر بھی جا کر لکیر کھینچی گئی، معاً عقیدہ پیدا ہو گیا، آپ جب تک عقیدے کی تبدیلی کی کوئی روشنی سامنے نہیں آتی، اس پر جمے رہیں اوراس میں کانٹ چھانٹ پیدا نہ کریں۔آپ دوسروں کے عقائد کا احترام ضرور کریں، لیکن اپنے عقیدے کو بھی کمزوریوں کے حوالہ نہیں ہونے دیں گے۔

کتنی ہی مصیبتیں ہیں جو اعتقاد اور عمل کے تمام گوشوں میں اسی دروازے سے آئیں کہ ان مختلف حالتوں کا امتیازی خط اپنی جگہ سے ہل گیا، اگر اعتقاد کی مضبوطی آئی تو اتنی دور تک چلی گئی کہ رواداری کے تمام تقاضے بھلا دیئے گئے اور دوسروں کے اعتقاد وعمل میں جبراً مداخلت کیجانے لگی، اگر رواداری آئی تو اس بے اعتدال کے ساتھ آئی استقامت فکر ورائے کیلئے کوئی جگہ نہ رہی، ہر عقیدہ لچک گیا۔ہر یقین ہلنے لگا۔(ایضاً،ص:۳۲۶)

مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں اسلام نے کسی بھی مذہب کے پیرو سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ کوئی نیا دین قبول کرے، بلکہ ہر گروہ سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے اپنے مذاہب کی حقیقی تعلیم پر سچائی کے ساتھ کاربند ہو جاؤ۔(ایضاً،ص:۴۱۶)

اس پر بس نہیں بلکہ قرآن نے ان راست باز انسانوں کے ایمان وعمل کا پوری فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے جو نزول قرآن کے وقت مختلف مذاہب میں موجود تھے اور جنھوں نے اپنے مذاہبوں کی حقیقی روح ضائع نہیں کی تھی۔(ایضاً،ص:۴۱۸)

نیز قرآن نے نوع انسانی کے سامنے مذہب کی عالم گیر سچائی اور رواداریوں کا اصول پیش کیا۔اس نے صرف یہی نہیں بتایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے بلکہ صاف صاف کہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں، دین خدا کی عام بخشش ہے، اس لئے ممکن نہیں کہ کسی ایک جماعت ہی کو دیا گیا ہو، دوسروں کا اس میں حصہ نہ ہو۔

خلاصہ:

حضور ﷺ ساری انسانیت کے لیے بشیر ونذیر بن کر تشریف لائے۔آپ ﷺ کی آرزو اور انتہائی کوشش یہ تھی کہ تمام انسان کفر وشرک کو چھوڑ کر اسلام قبول کرلیں مگر اس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے کسی پر جبر واکراہ کو روا

نہیں رکھا۔ مسلح جہاد بھی ابتداءً اپنے دفاع کے لیے مشروع ہوا۔ غیر مسلموں میں سے جس نے اسلام قبول نہ کیا مگر کوئی جارحیت بھی اختیار نہ کی بلکہ مسلم ریاست میں اطاعت گزار اور امن پسند رعیت بن کر رہنے پر آمادہ ہوا تو حضورﷺ نے اس قسم کے لوگوں کو نہ صرف ان کے اپنے مذاہب پر کاربند رہنے کی اجازت دی بلکہ ان کے ساتھ اس قدر حسن سلوک کا مظاہرہ کیا کہ انہیں کسی قسم کی ذلت یا گھٹن کا احساس تک نہ رہا۔ انہیں عام زندگی میں مسلمانوں کے مساوی حقوق حاصل تھے اور نظام عدل وانصاف میں بھی ان کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔ اس لیے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جس طرح کا برتاؤ حضورﷺ نے تکثیری معاشرے میں غیر مسلموں کے ساتھ فرمایا، تاریخ انسانی اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل نکتے غور طلب ہیں:

(الف) شرک کی مدلل اور واضح تردید کی جائے لیکن معبودان باطلہ کے سلسلے میں ناشائستہ الفاظ استعمال نہ کیے جائیں (جو گالی کی تعریف میں آتے ہوں)

(ب) اگر اقتدار اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو تو دیگر ادیان کے پیروؤں کو اپنے دین کے مطابق دینی مراسم انجام دینے کی پوری آزادی دی جائے۔

(ج) اہلِ ایمان کے اقتدار کی صورت میں مذکورہ بالا آزادی کے علاوہ دیگر ادیان کے حاملین کو تمام ثقافتی امور میں بھی پوری آزادی دی جائے یعنی وہ اپنا نظام تعلیم چلاسکیں اور معاشرتی معاملات میں اپنے مذہبی قانون پر عمل کرسکیں اور اس حد تک اپنا عدالتی نظام بھی قائم کرسکیں۔ اصولی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اُن کو تہذیبی خود اختیاری دی جائے۔

(د) اہلِ ایمان اگر اقتدار رکھتے ہوں تو وہ غیر مسلم شہریوں کو مجبور نہ کریں کہ وہ اسلامی ریاست کے دفاع میں عملاً بھی حصہ لیں۔ بس ان کے مالی تعاون کو کافی سمجھا جائے گا۔

(ہ) اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کو کسی ایسے کام کے لیے مجبور نہ کیا جائے جو ان کے معتقدات سے ٹکراتا ہو۔

☆☆☆

ماضی کے دریچوں سے

# اسلام اور مسلمان

مولانا مناظر احسن گیلانی

عام استعمال کے رو سے تو ہر وہ چیز جو مسلمانوں کی طرف کسی نہ کسی حیثیت سے منسوب ہو آج کل اس کو بھی لوگ اسلامی کہہ دیتے ہیں، حتی کہ اسی بنیاد پر اسلامی چار "اسلامی پانی" کے الفاظ آج تک کانوں میں نہ سہی، لیکن حافظوں میں تو اب بھی گونج رہے ہیں، جب چار کے بیچنے والے اپنی چار کو بیچنے کے لیے اسلامی کے اس لفظ سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے اور اسٹیشنوں کے بھشتی اسی لفظ کی پشت پناہی میں بخشش کا مستحق اپنے آپ کو قرار دیتے تھے،

لیکن ظاہر ہے کہ اسلام تو پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل مجدہٗ کا ایک پیغام ہے، ایسا پیغام جس میں اپنے بندوں پر حق تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ ذمہ داریاں عائد فرمائی ہیں، کائنات کے ماضی و مستقبل و حال کے متعلق فکری نظام عطا کیا گیا ہے، یعنی ہستی کا موجودہ نظام جس کا ایک جز خود ہم انسانوں کا وجود ہے۔ اس کی ابتداء اور اس کے آخری انجام و انتہا اور یہ کہ اس وقت یہ نظام جو چل رہا ہے کیسے چل رہا ہے، کون چلا رہا ہے، انہی اساسی اور بنیادی سوالوں کے جواب کے متعلق ہمیں کیا سوچنا چاہیے خود اس عالم کے پیدا کرنے والے نے جو علم اس راہ میں عطا کیا ہے، اس علم کو یقین وقطعیت کی قوت کے ساتھ ماننا اسی کی مذہبی تعبیر اعتقاد ہے، اور جو معلومات اس سلسلہ میں خالقِ کائنات کی طرف سے ہم پر کھولے گئے ہیں، اُن ہی کو عقائد کہتے ہیں، پھر زندگی کو اسی فکری نظام کے تحت رکھتے ہوئے صحیح انجام تک پہنچنے کے لیے ایک عملی دستور العمل یا ضابطہ پیدا کرنے والے نے عطا کیا، یہی اسلام کا عملی نظام ہے، آمنوا و عملوا الصالحات کا تعلق علم و عمل کے ان ہی دو نظاموں کے ساتھ قائم ہے،

ظاہر ہے کہ اسٹیشنوں پر بکنے والی چائے، یا تقسیم ہونے والا پانی، مندرجہ بالا دونوں باتیں یعنی اسلام کے فکری یا عملی نظام سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھا، نہ چار آسمان سے اُتری، اور نہ پانی، اور نہ چائے بنانے کا طریقہ اسلام میں بتایا گیا ہے، اور نہ پانی کو کنوئیں یا تالاب سے نکالنے، مشکوں میں بھرنے، پشت پر اٹھا کر پلیٹ فارم کے کنارے ٹہلنے پھرنے کا طریقہ، بھشتیوں کو اسلام نے سکھایا ہے،

مگر یہ فرض کر کے کہ مسلمان اس چار کو استعمال کریں گے، یا اس پانی کو پئیں گے کہنے والوں نے اس چار اور پانی کا نام اسلامی چار اور اسلامی پانی رکھدیا، اور یہی میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ "اسلامی" کے اس لفظ کو اتنی

وسعت دیکر لوگ اگر استعمال کر رہے ہیں، تو یہ بالکل ایک جداگانہ اور اپنی من مانی گھڑی ہوئی خود تراشیدہ اصطلاح یا ایسی اصطلاح ہے، جو خاص خاص اغراض کے زیر اثر کسی طرح چل پڑی ہے۔

لیکن اسلام کے اس لفظ کو صرف اس پیغام اور فکری و عملی نظام کی حد تک اگر محدود رکھا جائے جو بندوں کو پیدا کرنے والے خالق کی طرف سے پہنچایا گیا ہے، اور یہی ''اسلام'' کے لفظ کا صحیح مطلب ہے بھی۔ پیغام پہنچانے والے پر اعتماد کر کے خدا کے جن بندوں نے اس ''پیغام'' کو قبول کر لیا، اور اس کے مطابق جینے اسی پر مرنے کا قطعی فیصلہ جو کر چکے ہیں ان ہی کا نام مسلم ہے، اور اسی کی فارسی جمع لفظ مسلمان ہے جو مسلمانان کی فارسی اور مسلمانوں کی اردو جمع الجمع کے بعد اب خود مفرد ہو کر رہ گیا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مثلاً مسافر بن جانے کے بعد جن اسلامی مطالبات کی تعمیل کی طرف مسافروں کو توجہ دلائی گئی ہے، جیسے یہی کہ نماز میں قصر کریں، روزے ماہ رمضان سے، چاہیں تو موخر کر سکتے ہیں، یا ازیں قبیل سفر کے متعلق دوسرے مشورے جو مسافروں کو دین کی طرف سے دیے گئے ہیں، اُن کو پیش نظر رکھتے ہوئے سفر کو بھی دو قسموں میں تقسیم کر کے سفر کی ایک قسم کا نام اسلامی سفر اور دوسری قسم کا نام ''غیر اسلامی سفر'' رکھنے پر اصرار اور اس اصرار کو اس حد تک بڑھا دینا کہ اسلامی سفر کے ہر ہر چیز کا جائزہ لیا جائے، اور دیکھا جائے کہ کتاب وسنت میں اس کا ماخذ کیا ہے، مسافر نے بستر اجو باندھا ہے تو اس کی بندش میں اُس نے قرآن کی کس آیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کس حدیث کو پیش نظر رکھا ہے، بستر کس چیز سے باندھا، رسّی سے باندھا، چمڑے سے باندھا، ہولڈال میں باندھا، پھر یہ کہ کس سواری سے روانہ ہوا، زادراہ میں اپنے ساتھ کیا کیا رکھا، یہ اسی قسم کے بے شمار سوالوں کو اٹھا اٹھا کر اس پر بحث کرنا کہ مسلمان مسافر کا یہ سفر واقعی اسلامی سفر کہے جانے کا مستحق ہے، بھی یا نہیں خود سوچنا چاہیے کہ کس حد تک مناسب ہے؟ اور ایک سفر ہی کیا؟ ان کل قصوں میں جن میں بعض کا ذکر ابھی تمثیلاً کیا گیا، کیا ہر ایک میں اسلامی وغیر اسلامی کی اس تقسیم جاری کرنا اور اسلامی قرار پانے والی قسم کے متعلق تنقیحی سوالات کے اٹھانے، اور اس کے ہر ہر پہلو کو اسلامی قوانین کے اساسی ماخذوں اور بنیادی سرچشموں پر منطبق کرنے کی ضرورت اسلام کی سیزدہ صد سالہ تاریخ میں کیا کبھی محسوس کی گئی ہے،؟ لباس ہی کو لیجیے، چند ضوابط اسلام میں لباس کے متعلق بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً مردوں کو چاہیے کہ ریشم کا لباس استعمال نہ کریں، لوگ اسبالِ ازار کے مرتکب نہ ہوں، ان چند باتوں کو دیکھ کر اسلامی وغیر اسلامی لباس کی تقسیم اور لباس کے متعلق یہ سوالات کہ اس کا تراش کیا ہو، سلائی کیسے کی جائے، کیسے پہنا جائے،؟ کیا کسی زمانہ میں لوگوں نے ان سوالوں کو اٹھایا؟ عام طریقہ اب تک یہی ہوتا رہا ہے کہ زندگی کے جس شعبہ میں بھی مسلمانوں کو اسلام نے جن حدود میں رہنے کا حکم دیا ہے، بس ان حدود کو تو دیکھ لیا جاتا ہے، ان حدود کے اندر رہنے والے اپنے دین کے پابند مسلمان سمجھ جاتے ہیں، اور ان حدود سے تجاوز

کرنے والوں کو سمجھا جاتا ہے کہ اپنے دین کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

بہر حال اتنا دیکھ لینے کے بعد اس خاص شعبہ کے جن دوسرے پہلوؤں کے متعلق نفیاً یا اثباتاً کسی قسم کی تصریح نہیں کی گئی ہے، بلکہ آزادی بخشی گئی ہے کہ اپنی اپنی ضرورتوں اپنے اپنے حالات اور دوسرے اقتضاؤں کی بنیاد پر عقل و تجربہ عمل کی جو راہ پیش کرے، اسے مسلمان اختیار کریں، اصطلاحاً انہی کو ''مناجات'' کہتے ہیں، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً سفر ہی کو لیجیے، جب پیش آتا ہے تو چند خاص باتوں کے سوا ہر مسلمان کو اپنے سفر کے تمام پہلوؤں کے متعلق آزادی عطا کی گئی ہے کہ مصلحت کے مطابق جو کچھ اسکی سمجھ میں آئے اختیار کرے:

ظاہر ہے کہ کسی خاص مقام مثلاً لکھنو سے دلّی تک ایک ہی سفر کوئی کرے، اور سفر کے سارے اسلامی مطالبات کی تکمیل اس میں کی جائے، پھر بھی اس مسافر کا یہ خاص سفر جن بے شمار امور پر مشتمل ہوگا، ان میں ایسی چیزیں جن کو ہم اسلامی مطالبات کہہ سکتے ہیں، ان امور کے معاملہ میں جن کا ''مباحات'' سے تعلق ہے، شاید آٹے میں نمک سے زیادہ اُن کی حیثیت نہ ہوگی، یہی وجہ ہے کہ گو سفر میں بھی آدمی کو دین کے بعض مشوروں کو شریک کرنا پڑتا ہے، مگر محض اس کی وجہ سے سفر کی ایک مستقل قسم ''اسلامی سفر'' کی اصطلاح نہیں بنائی گئی۔

ہم یہی پوچھنا چاہتے ہیں، اور حاکمانہ اقتدار رکھنے والے مسلمانوں کو بھی اس میں شک نہیں، کہ اسلام نے ایک ضابطہ ضرور دیا ہے، لیکن جیسے قصر صلوٰۃ یا تاخیر صوم وغیرہ دینی مسائل کے جاننے والوں کے لیے سفر کے تمام مشکلات حل نہیں ہو جاتے، بلکہ ابتدائے سے سفر سے آخر تک ہر ہر قدم پر عقل و تجربہ، ضرورت وغیرہ کے لحاظ سے ہزاروں فیصلے کرنے پڑتے ہیں، اور عقل و تجربہ وغیرہ کی روشنی میں کیے ہوئے ان فیصلوں کی وجہ سے اس مسافر کا سفر جس نے ''اسلامی مطالبات'' کی تعمیل میں اپنے پورے سفر میں کوتاہی نہ کی ہو، جیسے اس مسافر کے سفر کو نہ غیر اسلامی کہا جا سکتا ہے نہ اسلامی، اور نہ محض اس لیے کہ دورانِ سفر میں وہ نمازوں میں قصر کرتا رہا، یا روزے میں تاخیر سے کام لیا، یہ یا اسی قسم کی چندگنی چند چیزوں کی وجہ سے سفر کی ایک مستقل قسم ''اسلامی سفر'' نکالی گئی۔

اسی طرح کسی علاقہ میں حکمرانی کا اقتدار جن مسلمانوں کے ہاتھوں میں آجائے اور جن مطالبات کی تکمیل کے ذمہ دار مسلمان حکمران ٹھہرائے گئے ہیں، ظاہر ہے کہ محض ان ذمہ داریوں کی تکمیل بھی اگر حکمرانی کے لیے کافی نہ ہو، تو یقیناً یہ اسلامی تعلیم کا نہ تو نقص ہوگا؛ اور نہ مکان و زمان، حالات و ماحول وغیرہ خصوصیات کی وجہ سے حکمرانی کے سلسلہ میں ان مسلمانوں کو عقل و تجربہ کی راہوں سے جن چیزوں کو اختیار کرنا پڑے، ان کی وجہ سے وہ بیچارے اس کے مستحق ہوں گے کہ اُن کے طریقۂ حکومت کو غیر اسلامی طریقہ حکومت قرار دیا جائے: اور جیسے یہ فتویٰ لگانا ان پر درست نہ ہوگا، اسی طرح میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ایسی حکومت جس میں زیادہ تر عقل و تجربہ کی روشنی میں نظر آنے والے حقائق ضرورۃً اختیار بھی کیے جاتے ہوں، اور چھوڑے بھی جاتے ہوں، اور ان ہی عقلی و تجربی

عناصر سے حکومت کی مشینری بھری ہوئی ہو، اگر ان ہی کے ساتھ ان معدودے چند اسلامی ضوابط کو بھی اس میں شریک کرلیا جائے، جن کی تعمیل کا مطالبہ مسلمان حکمرانوں سے کیا گیا ہے، جیسے مسافر اپنے سفر کے عقلی و تجربی عناصر کے ساتھ ان چند باتوں کا بھی پابند ہو جن کا حکم دین میں مسلمان مسافروں کو دیا گیا ہے، تو مسلمان حکمرانوں کے محض اس طرزِ عمل سے، یعنی حکمرانی کے ان معدودے چند ضوابط کو اپنے طریقۂ حکمرانی میں شریک کرلینے کی وجہ سے، ایسی حکومت کو اسلامی حکومت یا الٰہی حکومت کہنے کی وجہ بہ ظاہر ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اور آج تک مسلمانوں کی حکومت جہاں کہیں قائم ہوئی، جہاں تک میں جانتا ہوں اس کو ''اسلامی حکومت'' یا ''الٰہی حکومت'' وغیرہ ناموں سے شاید کبھی موسوم نہیں کیا گیا۔ یہ نام نہ عہد خلافتِ راشدہ میں حکومت کا ہم پاتے ہیں، اور نہ اس کے بعد قائم ہونے والی حکومتوں کو یہ نام کسی زمانہ میں دیا گیا۔ حکومت بنی امیہ، حکومتِ عباسیہ، حکومت غزنویہ، غوریہ، مغلیہ، عثمانیہ، اس قسم کے نام تو سننے میں آتے ہیں، لیکن ان مسلمان حکمرانوں نے کسی زمانہ میں اپنی حکومت کا نام حکومتِ اسلامیہ ''یا حکومت الٰہیہ'' رکھا ہو، کم از کم فقیر اس سے قطعاً ناواقف ہے۔

بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے کلیسا کے نام سے ''پوپ'' کے ہاتھ میں حکمرانی کا اقتدار آہستہ آہستہ جب منتقل ہوا، اور یورپ کے عام حکمرانوں پر برتری حاصل کرنے کے لیے دین کی پشت پناہی کی ضرورت پوپوں نے محسوس کی تو شاید دنیا میں یہ پہلی بدعت انھوں نے قائم کی، کہ عام حکمرانوں کی حکومت کے مقابلہ میں ''دینی حکومت'' یا عیسائی حکومت یا کلیسائی حکومت وغیرہ نام اپنی حکومت کو دیا، پھر جب کلیسا کے خلاف یورپ میں ردِّ عمل ہوا، تو کلیسائی حکومت کے مقابلہ میں ضرورت پڑی کہ تمیز کے لیے سیکولر حکومت لادینی حکومت'' ان حکومتوں کا نام رکھا جائے، جو ''پوپ'' کے سیاسی اقتدار کو توڑنے کے لیے اور ان کو توڑ کر قائم ہوئی تھیں۔

بہر حال جیسے سفر یا لباس اسی قسم کی ہر وہ چیز جس کے متعلق مسلمانوں کو مذہب کی طرف سے کچھ احکام و ضوابط عطا کیے گیے ہیں اُن کی تعمیل کی وجہ سے الٰہی سفر غیر الٰہی سفر یا اسلامی سفر غیر اسلامی سفر الٰہی لباس ''غیر الٰہی لباس'' وغیرہ قسمیں کچھ ان سنی اور انجانی پائی ہیں مجھے تو خیال یہی گذرتا ہے کہ الٰہی حکومت غیر الٰہی حکومت یا اسلامی حکومت غیر اسلامی حکومت، حکومتوں کے نام رکھنے کی یہ رسم شاید نئی رسم ہے، یا کچھ تعجب نہیں کہ کلیسا اور پوپت کی تاریخ کے ساتھ اس کا رشتہ نکل آئے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پینے والوں کی خصوصیت کی وجہ سے چائے یا پانی کا نام اسلامی چائے یا ''اسلامی پانی'' لوگوں نے جیسے رکھ دیا تھا کچھ یہی حال حکومتوں کے ان ناموں کا بھی ہو۔ اور کیا تعجب ہے کہ آئندہ بجائے اسلامی کے چائے اور پانی کا نام بھی الٰہی چاء ''اور الٰہی پانی'' رکھ دیا جائے اور توجیہ یہ کی جائے کہ اسلام کے ماننے والوں کے ساتھ چونکہ یہ چاء اور پانی مخصوص ہے، اور اسلام اللہ کا عطا کیا ہوا دین ہے، اس لیے اس چاء اور پانی کا نام الٰہی چاء اور ''الٰہی پانی'' رکھ دیا گیا۔

☆☆☆

# تبصرہ-۱

نام کتاب: مسائل و مباحث

مصنف: پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی

مرتب: ڈاکٹر ابوذر متین

ضخامت: ۷۳۴

اشاعت: ۲۰۱۸ء

ناشر: براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: پروفیسر محمد سجاد



اردو میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی مسائل پر یہ ایک اہم کتاب آئی ہے۔

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی یوں تو عربی زبان و ادب کے پروفیسر رہے ہیں لیکن ان کی اردو نثر مفرس اور معرب نہیں ہے بلکہ سادگی اور برجستگی کا خاص خیال رکھا ہے۔ آج کے خبر نویسوں اور کالم نویسوں کو اس کتاب کا مطالعہ لازمی طور پر کرنا چاہیے۔

اردو میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی، تعلیمی مسائل پر اپنی نوعیت کی یہ اکیلی انوکھی اور دلچسپ کتاب ہے۔ مصنف نے ۱۹۵۱ء سے ۲۰۱۵ء تک کے مضامین، کالم، خطوط وغیرہ مختلف اردو اخباروں میں لکھے تھے، ان سبھی کو یکجا کر دیا ہے، اس سے قبل ان کی کئی تصنیفات آچکی ہیں جن میں ان کی آپ بیتی ''دھوپ چھاؤں''، کتابوں کے درمیان اور مقالات ریاض شروانی قابل ذکر ہیں۔

مصنف کا براہ راست مولانا آزاد، گاندھی جی، نہرو جیسے لوگوں سے تعلق رہا ہے اور کئی ایسے بڑے رہنما علی گڑھ میں ان کے مہمان رہ چکے ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے تاریخ ساز حضرات سے ان کے مراسلے و مکالمے

رہے ہیں۔ پروفیسر شروانی کی عمر اب تقریباً ۱۰۰ سال کو پہنچ رہی ہوگی۔ اس لمبی عمر میں انہوں نے برصغیر کے اجتماعی عہد میں متعدد نشیب و فراز کو علمی گہرائی کے ساتھ بصیرت افروز دانشور کی حیثیت سے دیکھا ہے، پرکھا ہے اور پھر اس پر خامہ فرسائی بھی کی ہے۔

اس کتاب کے بارے میں ایک اہم بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ آزاد ہندوستان کی سیاسی تاریخ لکھنے والا محقق اگر اس سے روگردانی کر جائے تو عین ممکن ہے کہ اس کی تصنیف میں کئی اہم ترین پہلو تشنہ رہ جائیں۔ اس دعوے کی دلیل میں اس ضخیم کتاب کے ۷ا مختلف ابواب کے عنوانات کو یہاں من و عن پیش کیا جاتا ہے:

''مسلمانان ہند کے مسائل (۴۴ مضامین)، عالمی مسائل، (۲۰ مضامین)، ملکی مسائل (۱۲ مضامین)، قومیت، جمہوریت، سیولرازم، (۱۲ مضامین)، فرقہ واریت (۱۴ مضامین) فرقہ وارانہ فسادات (۱۲ مضامین)، تقسیم ہند (۸ مضامین)، ہندوپاک تعلقات (۵ مضامین)، مسئلہ کشمیر (۴ مضامین)، [اس میں وہ کہتے ہیں: میرے خیال سے اس کا ہندوستان میں رہنا خود کشمیریوں کے مفاد میں ہے، البتہ اسے بگاڑنے میں خود ہماری غلطیوں کو بھی بہت دخل رہا ہے]۔ بابری مسجد کا انہدام (۶ مضامین)، اردو زبان (۵ مضامین)، سرسید اور علی گڑھ (۳ مضامین)، مولانا آزاد (۵ مضامین)، خودنوشت (ڈائری کے چند اوراق)، سفرنامہ (۶ مضامین)''

اسی طرح وفیات میں:

آزادی کے بعد سیاسی و ادبی اہمیت کی حامل عظیم شخصیتوں کی وفات پر تعزیتی مضامین جن کی تعداد ۲۸ ہے، اور ان میں تنوع کا یہ عالم ہے کہ نہرو، آزاد، مدنی، کے علاوہ آچاریہ نریندر دیو، گووند سہائے، فیروز گاندھی، محمد حبیب، سید محمود، کے جی مشرووالا، جیسی شخصیات بھی شامل ہیں۔

آزادی کے بعد شروع کی دہائیوں میں ان کے بیشتر مضامین، شذرات، خطوط، Rejoinders وغیرہ مدینہ (بجنور) دوروزہ جمہور، ہفتہ وار دوست، ہفتہ وار پرچم ہند، روزنامہ قومی آواز، ملک و ملت جیسے اخباروں میں شائع ہوئے ہیں۔ ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء کے کچھ مضامین ہفت روزہ نیا ایشیا (علی گڑھ) اور نیا ہندوستان (علی گڑھ) میں شائع ہوئے ہیں۔''

۱۹۷۰ء اور بعد کی دہائیوں میں مذکورہ اخبارات کے علاوہ انہوں نے ماہ نامہ سیکولر ڈیموکریسی، سہ روزہ الجمعیۃ، پندرہ روزہ احتساب، پندرہ روزہ گوشوارہ (روڑکی) ہفتہ وار سچ رنگ، نئی دنیا، راشٹریہ سہارا، ہفتہ وار سب ساتھ، جرس (علی گڑھ) حال (پٹنہ) بلٹز (بمبئی) وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ غرض کہ اس فہرست سے آزاد

ہندوستان میں اردو صحافت کی تاریخ لکھنے میں بھی مدد لی جاسکتی ہے کہ کیسے کیسے اردو اخبارات وجود میں آئے اور پھر بند بھی ہو گئے۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی یوں تو عربی زبان وادب کے پروفیسر رہے ہیں لیکن ان کی اردو نثر مفرس اور معرب نہیں ہے بلکہ سادگی اور برجستگی کا خاص خیال رکھا ہے۔ آج کے خبر نویسوں اور کالم نویسوں کو اس کتاب کا مطالعہ لازمی طور پر کرنا چاہیے۔

بے باکی کے باوجود چند اہم موضوع کی جانب شاید ان کی توجہ مبذول نہ ہوسکی۔ جیسے: شاہ بانو سے متعلق تنازعہ، ایمرجنسی اور اس کی مزاحمت اور مسلمانوں کے اندر ذات پات۔ البتہ مسلمانوں کے ان گروہوں کی قلعی بہت اعتدال مگر چابک دستی کے ساتھ کھولی ہے جن مسلمانوں کو آزاد ہندوستان کی سیکولر جمہوریت یا آئیڈیا لوجی سے پرہیز رہا ہے۔ کئی مضامین انہوں نے الیکشن کے موقعوں سے بھی لکھے تھے۔ ۱۹۶۹ء کے اسمبلی انتخابات کے وقت، ۷ رجنوری کے ایک مضمون میں ان کی اپیل کا اقتباس موزوں ہوگا:

> ''میری اپیل رائے دہندگان سے یہ ہے کہ وہ مذہب وملت ذات پات، جماعت، ذاتی تعلقات اور اس طرح کے دوسرے تصورات سے اوپر اٹھ کر ایسے امیدواروں کو ووٹ دیں جن کی واضح قومی خدمات ہوں۔ جو فرقہ پرستی سے بالاتر ہوں، جو ایمان دار اور باصلاحیت ہوں، اور جو واقعی ہمارے دکھ درد کا مداوا کر سکیں یہ نہ ہو کہ وہ صرف ہاتھ اٹھانے کے لیے اسمبلی میں جانا چاہتے ہوں۔ (ص:۲۳۲)''

اسی ضمن میں دوسرے کالم بہ عنوان، یہ سیکولر جماعتیں! ۱۹۷۰ء کا اقتباس کئی عقدے کھولتے ہوئے آج کے مسائل کی عکاسی اور وضاحت کرتا ہے:

> ''حال میں ملک میں بعض ایسے واقعات پیش آئے ہیں جنہوں نے ہماری اکثر سیکولر کہی جانے والی جماعتوں کا بھرم پوری طرح کھول دیا ہے اور جو لوگ واقعی سیکولرزم میں عقیدہ رکھتے ہیں انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کیا ملک میں اس وقت کوئی جماعت بھی ایسی ہے جس پر اس سلسلے میں بھروسہ کیا جاسکے۔ تنظیم کانگریس نے جس ڈھٹائی سے اپنے بنیادی اصولوں کو پس پشت ڈال کر جن سنگھ کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے کا اعلان کیا ہے وہ موقع پرستی کی بد ترین مثال ہے۔ (ص:۲۳۳)''

> ''میں زمانہ طالب علمی ہی سے سیاست میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ اس بارے میں میرا ذہن صاف رہا ہے کہ مذہب اور وطن کے تقاضوں میں تصادم محض خیالی چیز ہے۔ حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دونوں کے حدود اگر پیش نظر رہیں تو آدمی ذہنی کشمکش

سے محفوظ رہتا ہے۔ اسی کو سیکولرزم کہتے ہیں۔ اسلام میں شوریٰ پر اصرار ملوکیت اور آمریت کو اس سے خارج کر دیتا ہے۔ آج کی دنیا میں پارلیمانی جمہوریت شوریٰ سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ (صفحات ۱۶-۱۵)''

آخر میں یہ بھی کہا جانا چاہیے کہ اردو زبان میں تاریخ، سیاست، اور عصری مسائل پر شاید ہی کوئی دوسری اتنی عمدہ کتاب دستیاب ہوگی، امید کی جاسکتی ہے کہ اردو قارئین اس کتاب کی جانب نہ صرف متوجہ ہوں گے بلکہ اس کے مطالعے سے انہیں لکھنے کی تحریک بھی ملے گی۔

☆

## تبصرہ-۲

**کتاب:** مطالعۂ شعروادب

**مصنف:** پروفیسر مقصود احمد

**ضخامت:** ۲۸۰

**اشاعت اول:** جنوری ۲۰۱۸ء

**ناشر:** حضرت پیر شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، پانکورناکہ، احمد آباد، گجرات

**مبصر:** ڈاکٹر شائستہ خان

یہ پروفیسر مقصود احمد، سابق صدر، شعبۂ فارسی، عربی و اردو، بڑودہ یونیورسٹی، (گجرات) کے ۱۳ مضامین کا مجموعہ ہے۔

غالب کے سلسلہ سے دو تحریریں ہیں، ایک مثنوی چراغ دیر کا تعارف ہے، جس میں نظم و نثر دونوں تراجم کا ذکر ہے۔ سنسکرت میں بھی اس کا ایک منظوم ترجمہ راشٹریہ سنسکرت سنستھان سے ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا (از ناہید عابدی)۔ مثنوی میں ۱۰۸/ اشعار ہیں، ڈاکٹر مقصود احمد نے ظ انصاری (۱۹۹۱) کے اردو ترجمے کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ منظوم تراجم میں انھوں نے پروفیسر حنیف نقوی (م ۲۰۱۳) کے ترجمے کا ذکر بھی کیا ہے، اور اس ترجمے کے چودہ پندرہ اشعار کا منظوم ترجمہ بطور نمونہ دیا ہے۔

مراسلہ

# صدیق مجیبی کے اشعار کے متن کی تصحیح

ڈاکٹر سرور ساجد

''سرمایۂ غزل: صدیق مجیبی کا انتخاب کلام، اکتوبر ۲۰۱۴ء، از: ڈاکٹر سرور ساجد''، جس پر پچھلے دنوں فکرنو کا تبصرہ نکلا تھا، اس میں چند اشعار میں کچھ ٹائپ کے تسامحات راہ پاگئے ہیں، ہم نے مناسب سمجھا کہ ان کا متن صحت کے ساتھ درج کردیں، جو اس طرح ہے:

وہ شخص روز مجھے میکدے میں ملتا ہے　　بھرے ہیں روح میں کانٹے بدن گلاب کا ہے
اک شہر جل رہا ہے کسی کو نہیں خیال　　اک شخص مر گیا تو حکومت اداس ہے
جہاں سکوت مسلط ہے دم بخود ہے حیات　　وہیں سے شور قیامت اٹھے عجب کیا ہے
ڈرتا ہوں کہ یہ دن کا لڑھکتا ہوا پتھر　　اس غار کا منھ بند نہ کردے میں جہاں ہوں
بیوی دکان بینک مکاں اور نماز شکر　　اتنا بھی خود پرست نہیں ہونا چاہیے

ایک غزل کے تین شعر جو صدیقی مجیبی نے مرتب کو خود سنائی تھی اور جو غالباً ہنوز غیر مطبوعہ ہے:

پستہ قدوں نے توڑ لیے سارے میٹھے پھل　　میں شاخ باردار جھکانے میں رہ گیا
پتھر نے اپنی بات بھی منوالی اور میں　　آئینہ آئینے کو دکھانے میں رہ گیا
سرمایۂ حیات تلف ہوگیا تمام　　اک زخم تھا جو دل کے خزانے میں رہ گیا

صدیق مجیبی، غالب ابوالکلام آزاد اور ہمارے عہد کے حسن نعیم والے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، انا جن کی شخصیت کی سب سے بڑی پہچان ہے، ان کے یہ شعر صدیق مجیبی کے مزاج کے اس پہلو کی توضیح میں ہیں۔

اپنا سر کاٹ کے نیزے پہ اٹھائے رکھا　　صرف یہ ضد کہ مرا سر ہے تو اونچا ہوگا
انا سر چڑھ گئی ہے اک بگولے کی طرح ایسی　　کہ سر جائے گا اک دن خوئے قربانی نہ جائے گی
غبار راہ ہوں لیکن انا اتنی تو رکھتا ہوں　　قدم رکھا تو ہر نقش کف پا سے جدا رکھا
سب کی پسند کا ہو وہ کردار میں نہیں　　ویسا ہی ہوں میں جیسا مجھے ہونا چاہیے

افتخار عارف اور چند دوسرے شاعروں نے جس طرح کربلا کا استعارہ کبھی صاف صاف کبھی اشارۃً استعمال کیا ہے اس سے ان کے اشعار چمک گئے ہیں، اس ذیل میں صدیق مجیبی کے یہ شعر قابل توجہ ہیں:

مری جانب سلگتی ریت تھی پیاسوں کے لاشے تھے　　ادھر دشمن تھے خیمہ زن ادھر دریا نکل آیا
ترے رونے سے اے ابرِ سیہ اب فائدہ کیا ہے　　قیامت تک رہے گی پیاس دامن گیر پانی کی

☆☆☆

## پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی کی نئی کتاب

# مسائل ومباحث

پروفیسر شروانی کی نئی کتاب مسائل ومباحث حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں ۱۹۴۹ء سے ۲۰۱۷ء تک کے سیاسی مسائل ومباحث پر تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ جن میں مسلمانانِ ہند، ہندوستان اور بیرونِ ہند سے متعلق امور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان میں تقریباً ۷۰ برس کے حالات وکوائف آجاتے ہیں۔

کتاب کی ضخامت ۳۴۷ صفحات ہے اور قیمت =/۵۰۰ روپے ہے۔

متعدد مشاہیر کی وفیات بھی شامل ہیں۔

ناشر

براؤن بکس پبلی کیشنز، نئی دہلی 110025

+91-9818897975,0571-2700088

ملنے کے پتے:

(۱) براؤن بکس، علی گڑھ

(۲) ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

(۳) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، علی گڑھ

Monthly **FIKR-E-NAU** Aligarh

---

## تصانیف پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی

| | | |
|---|---|---|
| ۱- | میر کارواں ابوالکلام آزاد | ۴۰۰ روپے |
| ۲- | انڈیا ونس فریڈم - ایک مطالعہ | ۴۰ روپے |
| ۳- | شذرات ریاض شروانی | ۳۵۰ روپے |
| ۴- | کتابوں کے درمیاں | ۵۰۰ روپے |
| ۵- | مقالات ریاض شروانی | ۴۰۰ روپے |
| ۶- | انساں کیسے کیسے | ۳۰۰ روپے |
| ۷- | دھوپ چھاؤں (زمانہ طالب علمی کے حالات) | ۲۰۰ روپے |

ملنے کا پتہ:

**ایجوکیشنل بک ہاؤس**

شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ